فخر عالم زبیری کی یادداشتیں

گورنر جنرل ہاؤس

سے

آرمی ہاؤس تک

مرتبہ

جمیل زبیری

فخرِ عالم زبیری کی یادداشتیں

گورنر جنرل ہاؤس

سے

آرمی ہاؤس تک

مرتبہ

جمیل زبیری

گورنر جنرل ہاؤس سے آرمی ہاؤس تک

یادداشتیں ۔ فخر عالم زبیری
مرتب کردہ جمیل زبیری
طباعت اوّل مئی ۱۹۹۳ء
تعداد ۵۰۰
شائع کردہ زبیری پبلشرز ۔ کراچی
طباعت خواجہ پرنٹرز اینڈ پبلشرز فون: 626776-442197

قیمت
۵۰ روپے

زبیری پبلشرز
بی ۳۹، ڈبلو بلاک ۔ علامہ اقبال ٹاؤن شمالی ناظم آباد
کراچی ۷۴۷۰۰ ۔ فون نمبر ۶۱۵۰۶۹

میں اپنی اس کتاب کو

اپنی چہیتی بیٹی دُرِدانہ سلطان

(مرحومہ) کی ان یادوں کے نام معنون کرتا ہوں

جو میرے اور میرے اہلِ خاندان کا سرمایہ ہیں

فخر عالم زبیری / بیگم

فہرست عنوانات

فخر عالم زبیری ڈھاکہ ایرپورٹ پر گورنر جنرل کے اے ڈی سی اور دیگر عملے کے ساتھ

جمیل زبیری

دیباچہ

اس کتاب کے بارے میں سب سے پہلی بات جو میں کہنا چاہتا ہوں یہ ہے کہ یہ نہ کوئی سیاسی کتاب ہے اور نہ ایف اے زبیری کی خود نوشت سوانح حیات ہے اس میں جہاں کہیں بھی سیاسی باتوں کا ذکر آیا ہے وہ محض ضمنی ہے۔ قائداعظم محمد علی جناح سے لے کر جنرل ضیاء الحق تک گزرنے والے سیاسی حالات اور واقعات اس کتاب کا اصل موضوع نہیں ہے بلکہ یہ صرف فخر عالم زبیری کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے اور اس اعتبار سے اہم ہے کہ زبیری صاحب شاید وہ واحد شخصیت ہیں جو قائداعظم سے ضیاء الحق کے زمانے تک ایوان صدر میں مستقلاً رہے ہیں اور اس دوران میں انھوں نے مختلف سربراہوں کو ایوان صدر میں اقتدار کی کرسی پہ آتے جاتے دیکھا ان کو سنا اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

ان یادداشتوں میں بہت سی باتیں ایسی ہیں جن کا علم عوام کو نہیں مگر چونکہ برسراقتدار سربراہ مملکت جب تک وہ اس عہدے پر فائز رہے انکی ہر بات جاننے اور معلوم کرنے کا عوام کو حق حاصل ہے اس لئے میں نے فخر عالم صاحب سے اس معاملے میں گفتگو کی اور ہم نے مل کر یہ منصوبہ بنایا کہ جن واقعات کا انہیں علم ہے

اور جواب تاریخ کے حصہ بن چکے ہیں، انھیں قلم بند کر لیا جائے چنانچہ میں نے قلم پکڑا اور ان کے ساتھ بیٹھ کر ان کی یادداشتیں مرتب کر لیں اور اس طرح یہ کتاب وجود میں آگئی۔

میں فخر عالم زبیری کو بچپن سے بہت قریب سے جانتا ہوں۔ وہ ایک نہایت ایماندار، سچے اور کھرے آدمی ہیں اور میں یہ بات سو فیصد یقین کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ انھوں نے جو واقعات بیان کئے ہیں ان میں ذرا سا بھی مبالغہ نہیں کیا گیا اور یہ سارے واقعات بالکل سچ ہیں اور ایک طرح ان کی تاریخی حیثیت بھی ہے کیونکہ ان واقعات کی روشنی میں ان تمام سربراہان حکومت کے کردار کے کچھ نئے گوشوں کا پتہ بھی چلتا ہے

یہ دعویٰ نہیں کیا جا سکتا کہ اس کتاب میں بیان کئے گئے سارے واقعات نئے ہیں جو اب تک عوام سے پوشیدہ تھے لیکن اس میں شک نہیں کہ جو واقعات خود فخر عالم کے علم میں ہیں یا جو ان کے ذاتی مشاہدے یا تجربے میں آئے ہیں وہ یقیناً ایک عام قاری کے لئے نئے اور دلچسپ ضرور ہوں گے۔

اس موضوع پر اس سے پہلے دو اور کتابیں تحریر کی جا چکی ہیں۔ ایک "شہاب نامہ" جو قدرت اللہ شہاب کی سوانح حیات ہے اور دوسری "ایوان صدر میں سولہ سال" جو ایم۔ بی خالد کی یادداشتوں کا مجموعہ ہے۔

شہاب نامہ میں گورنر جنرل غلام محمد سے صدر ایوب تک کے زمانے کے واقعات کا تفصیلی تذکرہ ہے کیونکہ قدرت اللہ شہاب نے غلام محمد، اسکندر مرزا اور پھر ایوب خان کا دور دیکھا ہے جب یحییٰ خاں نے مارشل لا لگایا اس وقت شہاب صاحب بیرون ملک چلے گئے اور ملازمت سے استعفیٰ دے دیا۔ ویسے تیسرے مارشل لا کے بیتیس روز بعد جنرل ضیاء الحق نے بھی قدرت اللہ شہاب کو اچانک طلب کر کے انہیں وزارت تعلیم کا کام سنبھالنے کے احکامات دے دیئے تھے۔ مگر انھوں نے "اپنی ضعیف العمری اور ریٹائرڈ زندگی کی آرام پسندی کی عادت اور کچھ عرصے کے لئے لندن

جا کر اپنے دوست ابن انشاء کی عیادت" کے عذر پیش کیے۔ اس کے باوجود ضیاء الحق نے انھیں ڈاکٹر اجمل جو اس وقت وزارت تعلیم کے سیکریٹری تھے، کے ہمراہ لندن بھجوا دیا ان کی لندن سے واپسی پر بھی ضیاء الحق نے یہ بات نہیں بھلائی تھی مگر شہاب صاحب کے بقول "مجھے تشویش تو ضرور لاحق ہوئی مگر میں خاموشی سے کان لپیٹ کر اسلام آباد میں بیٹھا رہا۔ اس دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت جنرل ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے دوسرے نورتن مل گئے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گزار ہوں کہ انھوں نے نہ تو اس موضوع پر پھر کوئی بات چھیڑی اور نہ ہی کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔"

"ایوان صدر میں سولہ سال" میں بھی تقریباً انہی سربراہوں کے زمانے کے واقعات کا تذکرہ ہے کیونکہ ایم۔ بی خالد بھی گورنر جنرل غلام محمد کے زمانے سے ایوب خان کے دور تک ایوان صدر میں ملازمت کرتے رہے اور بقول ان کے انھیں ایوان صدر سے فرار ہوتے ہیں کافی وقت بھی پیش آئی۔ انھوں نے ایوب خان تک فدا حسن سے سفارش کرائی کہ وہ انہیں آر۔ سی ڈی میں جانے کی اجازت دے دیں جہاں ڈپٹی ڈائریکٹر کے طور پر ان کا سلیکشن ہو گیا تھا۔

بقول ان کے فیلڈ مارشل نے انھیں بلا کر سمجھایا کہ اگلے برس صدارتی انتخابات تک رک جاؤ اس کے بعد بیشک چلے جانا۔ اگلے روز فدا حسن نے انھیں بلا کر کہا کہ صدر صاحب نے ان کے لئے دو سو ایکڑ اراضی اور نقد رقم کا حکم دیا ہے اور پوچھا ہے کہ کتنی رقم درکار ہوگی۔ مگر انھوں نے اراضی اور رقم لینے سے انکار کر دیا اور تہران جہاں آر سی ڈی کا دفتر تھا اپنے ٹرانسفر کی پھر درخواست کی اس پر فدا حسن حیران بھی ہوئے اور برہم بھی۔

صدر کے ملٹری سیکریٹری جنرل محمد رفیع نے بھی انھیں بہت سمجھانے کی کوشش کی پھر صدر صاحب کی بیگم نے ایم بی خالد کی بیگم کو بلوا کر تسلی دی اور کہا کہ پریشانی کی کوئی بات نہیں۔ وہ ان کی بچیوں کی شادی کے اخراجات بھی برداشت کرتے

کو تیار تھیں ۔ مگر ایم بی خالد نے کسی کی بات نہ مانی بیگم صاحب سے بھی اپنے ٹرانسفر کی سفارش کی بات کی۔

مگر ان کے ٹرانسفر کی فائل ایوب خاں دبائے رہے حتیٰ کہ قدحسن کے بعد عبدالقیوم صاحب ان کی جگہ آ گئے ۔ آخر جب انھوں نے ایوب خاں سے حتمی فیصلے کے لئے کہا تو ایوب خاں نے جھنجھلا کر ٹرانسفر کے آرڈر دیدیئے ۔ اور اس طرح یہ یہ دونوں حضرات ایوان صدر سے فرار حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

مگر ایف اے زبیری کو اس طرح کے اقدام کی ضرورت پیش نہیں آئی اور وہ اسی طرح مستعدی اور جانفشانی سے کام انجام دیتے اور مختلف سربراہان کو آتے جاتے دیکھتے رہے ۔ چونکہ اس سے پہلے لکھی جانے والی دونوں کتابیں صرف غلام محمد سے ایوب خان تک کے دور تک کا احاطہ کرتی ہیں ۔ اور ان سے پہلے اور ان کے بعد آنے والے سربراہان کے متعلق اس نوع کی کوئی تحریر سامنے نہیں آئی ہے اس لئے بھی فخر عالم صاحب کی یہ یادداشتیں خاصی اہمیت کی حامل ہیں ۔ اس کے لکھنے کے بعد ایوان صدر کے کچھ نئے زاویے سامنے آتے ہیں۔

مجھے یہ لکھتے ہوئے دکھ ہوتا ہے کہ ایف اے زبیری اور ان کی اہلیہ دونوں بڑے دکھی انسان ہیں ۔ راولپنڈی کا قیام اُن کے اس دکھ سے وابستہ ہے ۔ کیونکہ وہیں ان کی ایک نہایت بھیجی جوان بیٹی دردانہ سلطان ایک معمولی سے آپریشن میں ہمیشہ کے لئے داغ مفارقت دے گئی۔

دردانہ سلطان ریڈو (راولپنڈی آئی ڈونرز اور گنا ئزیشن) کی فاؤنڈر ممبر اور سینئر وائس پریذیڈنٹ تھی اور اس کے علاوہ دیگر سماجی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتی تھی ۔ ریڈو نے کچھ عرصہ قبل اس کے نام پر آنکھوں کا ایک اسپتال بھی قائم کر دیا ہے ۔ دردانہ کی زندگی میں اس کی سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ زیادہ سے

زیادہ دوسروں کے کام آسکے۔ وہ دنیا کے سارے دکھی لوگوں کو سکھ پہنچانا چاہتی تھی مگر قدرت کو یہ منظور نہیں تھا۔

ایسی ہستی کی موت کا غم کیا معنی رکھتا ہے اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جو اس سے دوچار ہوا ہو۔ میں اس کتاب کی تیاری کے سلسلے میں جب بھی ان سے اور ان کی بیگم سے ملا ہوں میں نے یہی محسوس کیا ہے کہ راولپنڈی کے ہر ذکر کے ساتھ انہیں بیٹی کی یاد ستاتی رہتی ہے۔ عین ممکن ہے کہ اس غم نے ان کو اتنا متاثر کیا ہو کہ بہت سے واقعات ان کے ذہن سے محو ہو گئے ہوں۔ انھوں نے کوئی ڈائری کبھی نہیں لکھی نہ کوئی نوٹس بنائے ہیں۔ جو کچھ اس کتاب میں ہے سب ان کی یادداشت پر مبنی ہے۔

فخر عالم زبیری صاحب صحیح معنوں میں پاکستانی ہیں اور اسی لئے انہوں نے اپنے بچوں کی شادیاں پاکستان کے مختلف علاقوں کے رہنے والوں سے کی ہیں۔ ان کی بڑی بیٹی شہناز کے شوہر طارق کا تعلق یوپی سے ہے منجھلی بیٹی انجم کے شوہر کیپٹن خورشید سندھ کے رہنے والے ہیں، چھوٹی بیٹی دردانہ مرحوم کے شوہر سلطان کا تعلق مشرقی پنجاب سے ہے اور بیٹے اسلم کی بیوی کے والد شملہ کے رہنے والے ہیں۔ ایک سچے اور کھرے پاکستانی کی حیثیت سے فخر عالم زبیری کو پاکستان سے جو محبت اور عقیدت ہے اس کا احساس جابجا اس کتاب میں محسوس کیا جاسکے گا۔ انہوں نے دردمندی کے ساتھ اپنے تاثرات بیان کئے ہیں۔ جنہیں تحریری شکل میں محفوظ کر لیا گیا ہے۔

بہرحال ہمیں اپنی اس کوشش کے ضمن میں کسی قسم کی خوش فہمی نہیں ہے۔ اگر اس سے قارئین کی معلومات میں تھوڑا سا بھی اضافہ ہو جائے تو ہم اسے اپنی محنت کا ثمر سمجھیں گے۔

اس کتاب سے متعلق پروفیسر ظفر عمر زبیری عاؔ نے مقدمہ تحریر کرکے تاریخ پاکستان کے جن عوامل کی نشاندہی کر دی ہے ان سے قارئین کو غور و فکر کا کچھ سامان یقیناً حاصل ہوگا کہ تاریخ کا مطالعہ سبق آموز ہونا چاہیئے۔

پروفیسر ظفر عمر زبیری

مقدمہ

فخر عالم زبیری صاحب، ان چند خوش نصیب افراد میں ہیں، جنہوں نے قائد اعظم سے لے کر جنرل ضیاء الحق کے ادوار کو بہت قریب سے دیکھ کر اپنی یادداشتوں کو کتاب کی صورت میں محفوظ کرلیا ہے۔ یہ خود چونکہ اہل قلم ہونے کا دعویٰ نہیں کرتے اس لئے جمیل زبیری کو قلم سنبھالنا پڑا۔ اور فخر عالم بھائی نے اپنے ماضی کی یادوں سے کچھ آبدار موتی ضرور حاصل کرلئے۔ اگر پہلے سے کتاب لکھنے کا خیال ہوتا تو یقیناً کچھ یادداشتیں کاغذ پر جمع کرتے رہتے اور پھر ان کی مدد سے تفصیلی کتاب لکھی جاسکتی تھی۔ یا لکھوائی جاسکتی تھی۔ یہ کتاب مختصر ہونے کے باوجود ایک جامع کتاب ہے اس لئے کہ اس میں پاکستان کے سربراہان مملکت کے بنیادی کرداروں کی وضاحت ملتی ہے جس کے نتیجہ میں ہم اس قومی تنزل سے دوچار ہیں۔ جسے فی الحال ہم نے اپنا مقدر سمجھ رکھا ہے۔

یہ مختصر مگر جامع کتاب تاریخ پاکستان کی ایک اہم کڑی ہے کہ اس کے مطالعہ کے بغیر ہم ان اندرونی سازشوں کو صحیح طور پر نہیں سمجھ سکتے، جن میں ہمارے سیاست داں، ہماری بیوروکریسی اور وہ طالع آزما، جنرل صاحبان شامل رہے۔ جنہیں مملکت پاکستان کو ایک ترقی یافتہ جمہوری ملک دیکھنا اس لئے گوارہ نہیں تھا کہ ان کے ذاتی مفادات پر اس سے چوٹ

پڑتی تھی۔ اور چونکہ انہیں استحصال کے لئے ایک وسیع میدان مل گیا تھا، اس لئے کبھی اسلام کے نام پر، کبھی زبان کے مسئلہ پر اور کبھی علاقائی اور صوبائی نفرتوں کی بنیادوں پر مملکت مستقل انتشار کی کیفیت برپا رکھی گئی جس کے نتائج کا ہم سب کو بخوبی علم ہے، کہ مشرقی پاکستان علیحدہ ہو گیا، فوجی آمریت نے جمہوری اداروں کی تباہی میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی اور مغربی پاکستان (یعنی موجودہ پاکستان) میں جاگیرداری اور قبائلی نظام مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ فخر عالم بھائی نے اپنی اس کتاب میں ان عوامل کی طرف تو اشارے نہیں کئے لیکن بین السطور جو بات بیان کی ہے، وہ ایک ایسا المیہ ہے، جس کے نتائج اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتے تھے۔ وہ المیہ یہ ہے کہ قائد اعظم کے انتقال سے پہلے سے ہی قوم کو "ڈس انفارمیشن" کا آہستہ آہستہ عادی بنانا شروع کر دیا گیا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ قیام پاکستان کے فوری بعد، پاکستان کو جن نازک مسائل سے بہ یک وقت دوچار ہونا پڑ گیا تھا۔ ان میں لاکھوں کی تعداد میں مہاجرین کی آمد، ملکی اخراجات کے لئے روپیہ کی کمی، ملکی نظم و نسق کو نئے سر سے منظم کرنا، بھارت کی طرف سے نہری پانی بند کرنے کی مسلسل دھمکیاں اور ان سب سے بڑھ کر کشمیر کا بھارت سے زبردستی الحاق۔ اور اس موقعہ پر ایک بڑے سیاسی عالم کا یہ فتویٰ بہت سوں کو ابھی تک یاد ہے کہ "کشمیر کی جنگ، جہاد نہیں ہے اس میں مرنے والا شہید نہیں ہوگا"۔ اور یہ فتویٰ ملکی اخبارات کے صفحہ اوّل پر جلی حروف میں شائع ہوا تھا۔ آج وہی نیم سیاسی اور نیم مذہبی جماعت جہاد کشمیر کانفرنسیں منعقد کر رہی ہے اور کشمیری مجاہدین کی امداد میں بھی کسی سے پیچھے نہیں ہے۔ اس وقت جہاد کشمیر یا جنگ کشمیر کی مخالفت، مسئلہ کشمیر

پر انتشار پیدا کرنا، اور قائداعظم اور قائد ملت کی در پردہ مخالفت کرنا تھا اس وقت سے لے کر آج تک ہمارے متعدد قومی اخبارات "ڈِس انفارمیشن" کی مہم میں اہل سیاست کے ساتھ برابر کے شریک ہیں۔ اور اب بھی خبروں کی اہمیت کو صوبائی وفاداری کے پیمانے پر بڑھایا اور گھٹایا جاتا ہے۔ قائداعظم تو اس "غلط اطلاعی" مہم کا زیادہ شکار نہ ہو سکے۔ اس لئے کہ ان کا انتقال قیام پاکستان کے بعد جلد ہی ہو گیا۔ لیکن جن دو عظیم ہستیوں کو ہمارے نام نہاد سیاست دانوں اور اخبارات نے بدنام کرنے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی، ان میں ایک تو قائد ملت، لیاقت علی خاں صاحب تھے اور دوسرے خواجہ ناظم الدین صاحب تھے جنہیں "قائد ملت" کا لقب دے کر قوم پر بڑا احسان کیا گیا تھا۔ قائد ملت کو تو بیگم رعنا لیاقت علی خاں کے حوالے سے عام طور پر مورد الزام ٹھہرایا گیا اور کراچی کے ایک انگریزی روزنامے نے تو قائد ملت کی مخالفت کو اپنی صحافتی پالیسی کے طور پر اپنا لیا تھا۔ یقیناً لیاقت علی خاں صاحب میں انسانی کمزوریاں تھیں مگر بعض حلقوں میں اب تک ان پر تنقید کرنا قوم و ملت کی خدمت تصور کیا جاتا ہے، تین سال پہلے مجھے راولپنڈی کی ایک جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا۔ پیش امام صاحب نے جو ایک مشہور عالم دین بھی ہیں اپنے اردو کے خطبے میں لیاقت علی خاں صاحب پر شد و مد کے ساتھ تنقید کرنی شروع کر دی اور پاکستان میں اسلامی نظام کے نافذ نہ ہونے کی تمام تر ذمہ داری مرحوم پر ڈال دی۔ اب اس عصبیت کو کیا جائے گا۔ جہاں تک خواجہ ناظم الدین کا تعلق ہے تو اس کتاب میں ان پر ایک علیحدہ باب ہے اور وہ اس لئے ہے کہ گورنر جنرل کی حیثیت سے وہ قائداعظم کے جانشین ہوئے تھے اور ان کے خلاف بھی ایک ایسی مہم کا آغاز کر دیا گیا تھا جس میں تمسخر کا پہلو نمایاں تھا۔ کراچی کے

ایک اردو روزنامہ کے جن کالم نگاروں نے اس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، ان میں مجید لاہوری کا نام شاعر کی حیثیت سے بھی نمایاں رہا، اور مزے لے لے کر خواجہ صاحب کی بسیار خوری اور مرغیوں سے ان کی دلچسپی کے تذکرے کئے گئے، جب کہ بقول فخر عالم زبیری صاحب حقیقت یہ تھی کہ "ان کے زمانے میں گورنر جنرل ہاؤس میں پارٹیاں بہت ہوتی تھیں۔ مگر وہ خود زیادہ نہیں کھاتے تھے بلکہ دوسروں کو کھلاکر خوش ہوتے تھے۔ ان کا حکم تھا کہ پورے ماہِ رمضان میں روزہ کھولنے کے وقت اسٹاف کے جو ممبر وہاں موجود ہوں وہ سب ان کے ساتھ روزہ کھولیں، چنانچہ روزانہ لان پر فرش بچھا کر افطاری وغیرہ کا انتظام کر دیا جاتا تھا، افطاری کے بعد سب لوگ باجماعت نماز ادا کرتے تھے۔ اس کی امامت دفتر کا ایک چپراسی ملّا نظیر کرتا تھا اور خواجہ صاحب بھی اس کے پیچھے نماز پڑھتے تھے۔"

یہ تصویر کسی تاندقلت کی نہیں ہے بلکہ ایک مومن کی ہے، جو خود سے زیادہ دوسروں کا خیال رکھتا تھا اور جس کی کئی مثالیں خواجہ صاحب کے عہد گورنر جنرلی میں، فخر عالم بھائی نے بیان کی ہیں، اور انہوں نے یہ شہادت بھی دی ہے کہ "تین ہستیاں ان کے (یعنی خواجہ صاحب کے) بہت خلاف تھیں۔

ان میں غلام محمد، چودھری محمد علی اور (مشتاق احمد) گورمانی شامل تھے اور یہ تینوں ٹریو (Trio) کے نام سے مشہور تھے۔ اور یہی لوگ خواجہ صاحب کے خلاف مختلف قسم کا سازشی پروپیگنڈہ کرتے رہتے تھے۔"

تاریخ پاکستان کے المیہ کا آغاز جس ٹکڈم نے کیا تھا اس کا تعلق ملک کی بیوروکریسی کے اس طبقے سے تھا، جو یہاں نہ جمہوریت چاہتا تھا اور

نہ عوام کے حقوق کی اہمیت کا قائل تھا۔

سیاست دانوں کو نوکر شاہی کے تابع بنانے کا کھیل شروع ہو چکا تھا، اور راولپنڈی کے جلسۂ عام میں لیاقت علی خاں کی شہادت نہ صرف جمہوریت کا قتل ثابت ہوئی بلکہ تحریک پاکستان کی اس نفی کا بھی آغاز ہو گیا جو آخر کار، مشرقی پاکستان کی علیحدگی اور بنگلہ دیش کے قیام کا باعث ہوئی۔

خواجہ ناظم الدین کو ایک نئی سازش کے ذریعہ قائد ملت کی جگہ وزیر اعظم بنا کر ان کی جگہ بیمار اور فالج زدہ غلام محمد کو گورنر جنرل کی کرسی پر بٹھا کر جمہوریت کے قاتلوں نے بساطِ سیاست کو بالکل ہی الٹ کر رکھ دیا۔ اور مشرقی پاکستان میں احساس محرومی کی جڑیں مضبوط ہونی شروع ہو گئیں جو آبادی کے لحاظ سے پاکستان کا اکثریتی علاقہ تھا۔

سیاست دانوں کے ساتھ غلام محمد کا رویہ، ماتحتوں کے لئے گالیوں کی بوچھار، اپنی پرسنل سکرٹری مس روتھ بورل (جنہیں امریکہ سے درآمد کیا گیا تھا) کے ساتھ ان کا مستقل معاشقہ لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب کو بلا کر گورنر جنرل ہاؤس میں کشتے تیار کرنے کے لئے خصوصی انتظامات۔ ملک کے اس وقت کے سب سے اہم عہدے کے اخلاقی دیوالیہ پن کی عبرت انگیز تاریخ ہے، جسے بغیر کسی کم و کاست کے بیان کر دیا گیا ہے۔ ہماری صحافت اور سیاست کا المیہ یہ تھا کہ خواجہ ناظم الدین کے مرغی خلانے کی تفصیلات تو عوام تک پہنچائی جاتی رہیں، لیکن غلام محمد کے لئے کشتوں کی تیاریوں پر دبیز

پردے ڈال دیئے گئے تھے، تاکہ مفلوج گورنر جنرل کو خوشامدیوں کے ٹولے قوم کے "محافظ اعظم" کے لقب سے نواز سکیں اور خوشی میں ان کے منہ سے بہتی ہوئی رال کا نظارہ کر سکیں۔

گورنر جنرل کی حیثیت سے اپنے اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے (جس کی منصوبہ بندی کسی ذہن پہلے کی جا چکی تھی) جب غلام محمد نے وزیراعظم خواجہ ناظم الدین کو گورنر جنرل ہاؤس بلا کر ان کے عہدے سے ڈسمس کر دیا تو سکریٹری دفاع میجر جنرل اسکندر مرزا اس وقت، گورنر جنرل ہاؤس میں موجود تھے، جس کے واضح معنی یہ ہی تھے کہ گورنر جنرل کو مکمل طور پر فوج کی پشت پناہی حاصل تھی اور اسی رات، کو جنرل ایوب خاں جنرل برکی، اور جنرل اعظم خاں نے جس طرح فاتحانہ طریقہ پر ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے وہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ فوجی ٹولے نے نوکر شاہی کے ساتھ ملکی اقتدار میں مکمل شرکت کا فیصلہ کر لیا تھا، اور غلام محمد سے اسکندر مرزا نے وہ کام لے لیا، جو کوئی نارمل سیاستدان نہیں کر سکتا تھا۔ یہ ایسے وزیر اعظم کی پہلی برطرفی تھی جسے قومی اسمبلی میں اکثریت کی حمایت حاصل تھی۔ غلام محمد کا دور فوجی آمریت کیلئے راہ ہموار کرنے کا دور تھا۔ اور یہیں سے فوج کے مقابلے میں نوکر شاہی کی پسپائی کا آغاز بھی ہونے والا تھا۔ خواجہ ناظم الدین کی برطرفی کے بعد دستور ساز اسمبلی (قومی اسمبلی) کی برطرفی کا جو حکم نامہ مورخہ ۲۴ اکتوبر ۱۹۵۴ء کو جاری ہوا اس کی وجہ یہ بیان کی گئی کہ چونکہ "دستور ساز اسمبلی عوام کا اعتماد کھو چکی تھی" اس لئے اسے توڑ دیا گیا۔ حقیقت ظاہر ہے کہ یہ نہیں تھی۔ اور غلام محمد کا یہ حکم نامہ، ملک کی سیاست پر ایک ایسا

ضرب کاری ثابت ہوا کہ اقتدار اعلیٰ کا ادارہ تہس نہس ہو کر رہ گیا۔ پاکستان میں اقتدار برطانوی حکومت نے دستور ساز اسمبلی کو منتقل کیا تھا نہ کہ گورنر جنرل کو۔ اقتدار اعلیٰ پر مزید ضرب اس وقت کے چیف جسٹس محمد منیر نے لگائی جب انہوں نے دستور ساز اسمبلی کے صدر مولوی تمیز الدین خاں کے خلاف اپنے فیصلے کا اعلان کیا۔ ان کے یہ غیر منطق الفاظ کہ "اگر کبھی دستور ساز اسمبلی کو یہ مغالطہ تھا کہ وہ اس ملک کا مطلق العنان ادارہ ہے تو وہ جنت الحمقاء میں رہتی تھی"۔ اسمبلی توڑنے کا جو مقصد فخر عالم زبیری صاحب نے بیان کیا ہے وہ دراصل اس حقیقت پر مہر تصدیق لگاتا ہے کہ "خواجہ صاحب آئین ساز اسمبلی میں اپنا مسودہ آئین پیش نہ کر سکیں"۔ نوکر شاہی اور فوج کے جن اعلیٰ عہدے داروں نے اس سازش میں حصہ لیا تھا، انہوں نے اس مملکت کے ساتھ کس قدر وفاداری کا ثبوت دیا تھا یہ اب تاریخ کا حصہ بن چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ پاکستان میں ابھی تک پارلیمانی نظام نے جڑیں نہیں پکڑیں اور یہاں جمہوریت اور آمریت کی رسہ کشی برابر جاری ہے۔

غلام محمد کے جبری ریٹائرمنٹ کے بعد، میجر جنرل اسکندر مرزا کو گورنر جنرل کے عہدے پر فائز کرنا ہمارے سیاسی دیوالیہ پن کا واضح ثبوت ہے۔ اس لئے کہ سیاست، مکمل طور پر نوکر شاہی کے قبضہ میں جا چکی تھی۔ خواجہ ناظم الدین کے سیاسی جانشین محمد علی بوگرہ کو بھی آخر کار وزیر اعظم کے عہدے سے مستعفی ہونا پڑا۔ اور ان کی جگہ چودھری محمد علی

اس عہدے پر فائز کر دیئے گئے۔ جو دوسری دستور ساز اسمبلی گورنر جنرل کے ۱۹۵۵ء کے آرڈر نمبر ۱۵ کے مطابق وجود میں آئی تھی اس کے اراکین کی خرید و فروخت کا بازار اسی زمانے میں گرم ہوا۔ اور اسکندر مرزا نے اپنی سیاسی جماعت ریپبلکن پارٹی اسی بنیاد پر قائم کی تھی۔ "ہارس ٹریڈنگ" جس کا آغاز اسکندر مرزا نے کیا تھا، اب ہماری قومی سیاست کا مزاج بن چکی ہے، اور یہ الزام لگا کر کسی بھی حکومت کو برطرف کیا جاسکتا ہے۔

فخر عالم زبیری صاحب نے اسکندر مرزا اور بیگم ناہید اسکندر مرزا کے تذکروں میں وہاں بخل سے کام نہیں لیا جہاں ان کی بعض خوبیوں کا احوال تحریر کیا ہے۔ خانم ناہید کی تعریف کرتے ہوئے انہوں نے لکھا ہے کہ ان کے "شوق آرائش نے چند ہی دنوں میں ایوان صدر (اسکندر مرزا، ۱۹۵۶ء کے دستور کے نفاذ کے بعد پاکستان کے پہلے صدر بھی منتخب ہو چکے تھے) سے

وائے نادانی متاع کارواں جاتا رہا: کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا)

کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔ اس کا باغ تو اس قدر خوبصورت بنا دیا کہ پاکستانی اور غیر ملکی خواتین خاص طور پہ باغ دیکھنے آتی تھیں۔ ان کا نظم بھی مثالی تھا۔ وہ سیاسی معاملات میں بھی اسکندر مرزا کو مشورے دیتی تھیں۔" فخر عالم بھائی نے جو دیکھا تھا، اسے الفاظ کے ہیر پھیر کے بغیر بیان کر دیا ہے، اور یہی بے ساختگی اس کتاب کی نمایاں خصوصیت بھی ہے۔

اسکندر مرزا کا دور (اکتوبر ۱۹۵۵ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء) نوکر شاہی

کے انتہائی عروج کا زمانہ تھا، اس میں آئی۔ آئی چندریگر، حسین شہید سہروردی اور فیروز خان نون جیسے سیاست داں، نوکر شاہی کے ہی رحم وکرم پر ہو کر رہ گئے تھے، چار وزرائے اعظم، اسکندر مرزا کی چال بازیوں کا شکار ہوئے۔ اور اس وقت کے سربراہ فوج، جنرل ایوب خاں (جو وزیر دفاع بھی تھے) اس وقت کے منتظر تھے کہ کب وہ گھڑی آئے جب سیاسی کھیل ختم ہو اور ملک میں مارشل لاء کے نفاذ کا جواز پیدا ہو جائے۔

جب اکتوبر ۱۹۵۸ء کے ابتدائی دنوں میں اسکندر مرزا نے ملک میں مارشل لا نافذ کر کے جنرل ایوب خان کو چیف مارشل لا ایڈ منسٹریٹر نامزد کر دیا تو فخر عالم زبیری صاحب کے مطابق بیگم ناہید اس پر بے حد ناراض تھیں کہ ایسا کر کے انہوں نے اپنے ہاتھ پاؤں خود کٹوا لئے ہیں۔ یہی وہ فاش غلطی تھی جو اسکندر مرزا کے اقتدار کے خاتمہ کا باعث ہوئی اور جنرل ایوب خاں کی دیرینہ آرزو پوری ہو گئی۔ جس کی تفصیلات خود ایوب خاں نے اپنی سوانح عمری میں بیان کی ہیں۔

ایوب خاں کا دور (اکتوبر ۱۹۵۸ء سے مارچ ۱۹۶۹ء تاریخ وسیاستِ پاکستان میں عجب تضادات کا دور تھا جن کی جھلکیاں اس کتاب میں موجود ہیں۔ ایک خاص بات جس کی طرف فخر عالم صاحب نے واضح اشارہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب ۱۹۵۹ء میں دارالحکومت کو کراچی سے اسلام آباد منتقل کیا گیا تو حکومت پاکستان کے بنگالی عملے کو اس سے بہت تکلیف ہوئی، اور انہوں نے

"ایوب خاں کو کھلم کھلا گالیاں دینی شروع کر دیں جس کا میں خود گواہ ہوں اور میں سمجھتا ہوں کہ علاوہ دیگر عوامل کے، دارالحکومت کی تبدیلی، بھی مشرقی پاکستان کی علیحدگی کی ایک بڑی وجہ تھی۔"
ایوب خاں نے اپنی حکومت کو مضبوط کرنے کے لئے دارالحکومت کو تبدیل کیا تھا، لیکن انہیں اور ان کے مشیروں کو یہ احساس تک نہ تھا کہ ملکی بقا اور سالمیت کو وہ شخصی اقتدار کی خاطر داؤ پر لگا رہے ہیں۔ اور یہ روایت اگر چل پڑی تو اس "عظیم اسلامی مملکت" کا کیا انجام ہوگا۔ جنرل ایوب خاں کے طویل دور حکومت کا موازنہ جنرل ضیاء الحق کے دور سے کیا جا سکتا ہے۔ مارشل لاء کے سائے میں پروان چڑھی جمہوریت یا "اسلامی طرز حکومت" پاکستانی مسائل کا مداوا ثابت نہ ہو سکی۔ یہ دونوں فوجی حکمراں خود کو قوم کا نجات دہندہ سمجھتے رہے اور سمجھاتے بھی رہے۔
دونوں میں بعض ذاتی خوبیاں ضرور تھیں، لیکن ایک کی "بنیادی جمہوریت" اور دوسرے کا یہ دعویٰ کہ شوکت اسلام کے وہ ہی علمبردار ہیں، ایسی خوش فہمیاں تھیں کہ جو دیرپا ثابت ہی نہیں ہو سکتی تھیں۔ فخر عالم زبیری صاحب نے ان دونوں فوجی حکمرانوں کی ذاتی خوبیوں کو سراہا بھی ہے اور ان کی بعض کمزوریوں کی طرف اشارے بھی کئے ہیں، اور ایک سرکاری ملازم کی حیثیت سے ان فرائض کی ادائیگی کو بھی تسلیم کیا ہے، جو انہیں حکم حاکم کے طور پر ادا کرنے ہوتے تھے۔ یہ تو ایک سیاسی المیہ تھا کہ ایوب خاں نے محترمہ فاطمہ جناح کے مقابلے میں صدارتی انتخاب لڑا بھی اور جیتا بھی

لیکن فخر عالم زبیری صاحب کو یہ کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوا کہ اس انتخابی مہم کے سلسلے میں ایوان صدر کے تمام عملے کو ملوث کر دیا گیا "ہم لوگ مشرقی پاکستان تک گئے۔ جہاں ایک اسپیشل ٹرین چلا گئی۔ میں نے بھی اس ٹرین میں مشرقی پاکستان کے مختلف حصوں کا سفر کیا اور پبلسٹی کا کام کیا" یہ بات سب ہی کے علم میں ہے کہ جس انتخاب میں "بنیادی جمہوریتوں" کے ذریعہ مس جناح کو شکست دی گئی تھی اس میں بڑے پیمانے پر دھاندلیاں ہوئی تھیں اور اس کتاب میں ایوب خاں کے زوال کی جو وجوہات بیان کی گئی ہیں ان میں اس ایک وجہ کا تذکرہ بھی موجود ہے۔ بھٹو اور ایوب خاں کے قریبی تعلقات اور پھر ان دونوں میں یکایک شدید اختلافات کا رونما ہونا، دونوں کے مزاجوں کے ذکی الحس ہونے کا ثبوت ہے۔

ایوب خاں، غصہ میں آکر دوسروں کو سخت وسست بھی کہہ دیا کرتے تھے، لیکن بھٹو صاحب اسے بہت زیادہ برداشت نہ کر سکے۔ اور "تا شقند کی بلی" کو تھیلے میں دبا کر ایوان حکومت سے باہر آ گئے۔ ایوب خاں کے زوال میں بھٹو صاحب کا جو کردار رہا، اس سے تاریخ پاکستان کے طالب علم بخوبی واقف ہیں۔ لیکن چونکہ سیاست اچھاڑ پچھاڑ کا ہی کھیل ہے اس لئے اس میں نہ کوئی محسن ہوتا ہے اور نہ کوئی احسانمند ہوتا ہے، قوم وملک کے "بڑے لوگ" ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کی مسلسل کوششوں میں لگے رہتے ہیں کہ کرسی اقتدار تک پہنچنا یا اس کی حفاظت کرنا ہی بنیادی مقصد بن چکا ہے اور "قومی مفادات" صرف تقریروں اور بیانات کے اندر محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔

ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اقتدار پر قابض ہونے والے اپنی ہی تاریخ سے کوئی سبق حاصل نہیں کرتے ۔ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اب انہیں کوئی ہٹا نہیں سکے گا ۔ اور اس کوشش میں وہ سیاسی فلسفہ اور سیاسی ہتھکنڈے میں کوئی فرق بھی محسوس نہیں کر پاتے ۔ جنرل ایوب خاں کی بنیادی جمہوریت، جنرل یحییٰ خاں کا یہ زعم کہ وہ نشہ میں بھی سیاست کر سکتے ہیں، ذوالفقار علی بھٹو کا " روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ " اور جنرل ضیاء الحق کا سیاسی اسلام، سب ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اور ان چاروں حکمرانوں کو دیکھا جائے تو ان کا آپس میں کتنا گہرا تعلق تھا۔ ایوب خاں کے ماتحت، یحییٰ خاں بھی تھے، بھٹو بھی تھے۔ اور ضیاء الحق بھی تھے ۔ ان تینوں فوجیوں کے درمیان بھٹو، وہ واحد سویلین ہیں جنہوں نے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کی حیثیت سے بھی اس ملک پر حکومت کی، ایوب خاں کے بھٹو پر احسانات اور بھٹو کے ضیاء الحق پر احسانات، اور پھر ان احسانات کو نظر انداز کر کے حکومتوں کا تختہ الٹ دینا ایک ہی تسلسل کا منظر پیش کرتا ہے ۔ ان چاروں میں سب سے زیادہ ذہین اور پڑھے لکھے بھٹو تھے ۔ لیکن وہ بھی شعبدے بازی کے علاوہ کچھ نہ کر سکے ۔ ایوب خاں کے متعلق تو فخر عالم زبیری صاحب نے قدرت اللہ شہاب کے ہی بیان پر اپنی بات ختم کی ہے کہ وہ نہ انقلاب پسند تھے اور نہ انقلاب انگیز " ان کے کردار میں میانہ روی، اعتدال پسندی، مصلحت اندیشی اور عاقبت طلبی کے عناصر اس قدر غالب تھے کہ کسی شعبے میں بھی انقلاب کا تقاضہ ان کے بس کا روگ نہ تھا"۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کے نام پر وہ

معمولی چھان پھٹک اور جھاڑ پونچھ کے علاوہ کوئی دور رس کارنامہ انجام نہ دے سکے۔ فوجی حکمرانوں سے اس سے زیادہ توقع بھی کیا کی جا سکتی ہے۔

ایوب خاں کے جانشین یحییٰ خاں، جس کردار کے حکمراں ثابت ہوئے، وہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، ذرا غور کیجیے کہ حکمراں، ان کے مشیر، اور دیگر سیاسی قائدین اس قدر بے خبری کے عالم میں تھے کہ انہیں سانحۂ مشرقی پاکستان کے انجام کا احساس تک نہ ہو سکا تھا، یہ "جنت الحمقاء" میں رہنے والے لوگ تھے، جو یحییٰ خاں کی مے نوشی اور عیاشی کو برداشت کرتے رہے، اور جس انداز میں برداشت کیا، اس کی صاف جھلک اس کتاب میں موجود ہے۔ ایک موقع پر میڈم نورجہاں (جب کسی انٹرویو میں پاکستان سے اپنی والہانہ محبت کا اظہار کرتی ہیں تو اسلام سے بھی اپنی عقیدت کا تذکرہ ضرور فرماتی ہیں) نے جس بے تکلفانہ انداز میں صدر مملکت سے فون پر گفتگو کی تھی اور جس کا تذکرہ کیا گیا ہے اس سے اعلیٰ قیادت کی "اخلاقیات" کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ زوال کا ایک سلسلہ جاری تھا کہ جس کا نتیجہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی ہی میں ہوا اور اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کی زیادہ آبادی کو، پاکستان میں جمہوریت کے خلاف کب تک استعمال کیا جا سکے گا۔ اگر مغربی پاکستان میں (جو اب یہی پاکستان ہے) جاگیرداری اور قبائلی نظام کو برقرار رکھنا ہے۔ یہی کوشش فوجی حکمرانوں کی رہی، یہی نوکر شاہی کے پیش نظر رہا اور یہی ہمارے سیاست دانوں کی سیاست کا محور ہے۔ مشرقی

پاکستان میں پاکستانی فوج نے ہتیار ڈال دیئے تو کیا ہوا؟ مقصد
تو بالآخر حاصل ہو ہی گیا۔ پاکستان میں قبائلی اور جاگیرداری
نظام کو بچا لیا گیا، اس پر کوئی ضرب نہیں لگی۔ اس طرح اس تضاد
کا بھی خاتمہ ہوگیا جو "برابری" PARITY کے اصول پر قائم کیا گیا تھا۔

یحییٰ خاں کے زوال کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو ایک نیا لیکن ٹوٹا
ہوا پاکستان ملا تھا۔ ان کی غیر معمولی صلاحیتوں سے یہ توقع تھی کہ وہ نئے
پاکستان کو بہتر انداز میں استوار کریں گے اور ماضی کی غلطیوں کو دہرایا نہیں
جا سکے گا۔ جیسے جیسے ان کے اقتدار کو استحکام حاصل ہوتا گیا، ان پر
اقتدار کا نشہ بھی گہرا ہونے لگا۔ وہ اپنی تمام علمیت، قابلیت اور خداداد
صلاحیتوں کے باوجود، جن کا تذکرہ فخر عالم زبیری صاحب نے فراخدلی سے
کیا ہے، خود کو اس انجام سے محفوظ نہ رکھ سکے، جسے تاریخ کی زبان میں،
عبرت ناک کہا گیا۔ اور یہ عجیب اتفاق ہے کہ سانحۂ مشرقی پاکستان کے
تینوں اہم کرداروں (اندرا گاندھی، شیخ مجیب، اور بھٹو) کا انجام یکساں
ہی ہوا، حالانکہ ان تینوں کو غیر معمولی صلاحیتوں کا مالک سمجھا جا رہا تھا
مگر تقدیر کے فیصلوں کو دعاؤں سے تو تبدیل کیا جا سکتا ہے، اس کے
علاوہ کوئی دوسرا طریقہ نہیں ہے۔

اس کتاب میں بھٹو صاحب کے ذکر میں ضمناً تذکرہ اس وقت کے صدر
مملکت، چودھری فضل الٰہی کا بھی آگیا ہے جنہیں بھٹو صاحب نے بالکل ہی
بے بس صدر میں تبدیل کر دیا تھا۔ فخر عالم زبیری صاحب نے خود ایوانِ
صدر پر وہ نعرہ لکھا دیکھا تھا، جو وزیر اعظم کے اختیارات کا مظہر تھا۔ یعنی
"صدر فضل الٰہی کو رہا کرو"۔ ہم ابھی تک تقسیم اختیارات میں کوئی توازن

قائم نہیں کر سکے ہیں اور نتیجہ میں ایک سیاسی بے یقینی کی کیفیت ہے کہ جو ختم ہی نہیں ہو پاتی۔ اور یہ سلسلہ ہنوز جاری ہے۔

بھٹو صاحب کی شخصیت ان کی صلاحیتوں اور ان کے عبرت ناک انجام پر تو اس مدت میں کئی اہم کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر فخر عالم بھائی نے بھٹو صاحب کے تذکرے میں قضا و قدر کے جن معاملات پر روشنی ڈالی ہے وہ حیرت انگیز بھی ہیں اور عبرتناک بھی۔ کاش! ہمارے سیاستدان ان چھوٹے چھوٹے واقعات سے ہی کچھ سبق حاصل کر لیں۔ جو اس کتاب میں تاریخی پس منظر کے ساتھ بیان کر دیئے گئے ہیں۔

جنرل ضیاء الحق کے برسر اقتدار آنے کے بعد، ایف۔ اے۔ زبیری صاحب نے جو یہ پیش گوئی کی تھی کہ نوے دن کے اندر اندر انتخابات کرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہ حرف بہ حرف درست ثابت ہوئی اس لئے کہ یہ بات انہوں نے اپنے طویل تجربہ کی بنا پر کہی تھی، جو انہیں "گورنر جنرل ہاؤس سے آرمی ہاؤس" میں حاصل ہو چکا تھا۔ جنرل ضیاء کو ان کے مشیروں اور حواریوں نے "محافظ اسلام" کے منصب پر فائز کرنا چاہا تھا۔ اور یہ صحیح ہے کہ جنرل ضیاء کا بہت بڑا کارنامہ افغانستان میں روسی جارحیت کے خاتمہ کے ساتھ، خود عظیم روس "کا ٹکڑے ٹکڑے ہو جانا ہے۔ مگر چونکہ ان واقعات کا تعلق زبیری صاحب کے ریٹائرمنٹ کے بعد سے ہے" اس لئے ان کا تذکرہ کتاب میں نہیں ہے۔ زبیری صاحب، جنرل ضیاء کے برسر اقتدار آنے کے ٹھیک دو سال بعد، یعنی ۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو، ابتی ملازمت سے عزت و خیریت کے ساتھ ریٹائر ہو گئے۔ اور اس طرح مرحوم جنرل ضیاء کی حکومت سے ان کی طویل رفاقت اختتام پذیر ہوئی۔ جنرل ضیاء کی

اپنی خوش اعتقادی کے ساتھ علم نجوم کے جو اثرات وہ محسوس کرتے تھے وہ
ان کی زندگی کے آخری ایام میں مستقبل کی غیر یقینی حالات کے آئینہ دار
ہیں۔ زبیری صاحب نے اس کیفیت کو اس کتاب میں واضح کر دیا ہے۔
یہ کتاب سنہ ۱۹۴۷ء سے ۱۹۷۹ء کے ۳۲ سالہ ادوار کا احاطہ
کر رہی ہے اور اس کی خوبی یہ ہے کہ چھوٹے چھوٹے واقعات سے بڑے
بڑے حکمرانوں کے قدوں کو ناپا گیا ہے۔ اور تکلیف دہ بات یہ ہے کہ
بظاہر قد آور حکمراں ایسے بونے ثابت ہو رہے ہیں جن کی مثالیں صرف
تیسری دنیا کے ممالک ہی میں مل سکتی ہیں۔ تاریخ کے ایک وسیع دور
کی یادداشتوں کو فخر عالم زبیری صاحب نے محفوظ کر رکھا تھا انہیں
جمیل زبیری نے کاغذ پر منتقل کر کے اس آئینہ کو زیادہ واضح کر دیا ہے جو
ہمارے ماضی کو اپنی گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ زبیری پبلشرز کی طرف سے
اس کتاب کی اشاعت، قومی اور سیاسی تاریخ میں یقیناً ایک اضافہ ثابت
ہوگی حالانکہ جمیل زبیری نے اپنے دیباچہ میں اس خیال کا اظہار کیا ہے
کہ یہ کوئی سیاسی کتاب نہیں ہے۔

سرکاری ملازمت اور ایوان صدر میں داخلہ

قائداعظم محمد علی جناح

"میں نے قائداعظم سے لے کر جنرل ضیاء الحق کے زمانے تک اپنی ملازمت کا سارا وقت ایوان صدر میں گزارا اور اس دوران میں مجھے تمام سربراہان مملکت کو دیکھنے، ان سے ملنے اور ان کے ساتھ کام کرنے کا موقع ملا۔

اب جب کہ میں ملازمت سے ریٹائر ہو گیا ہوں ایسا لگتا ہے جیسے میں زندگی بھر ایک ڈرامہ دیکھتا رہا ہوں۔ اس ڈرامے کے کردار اسٹیج پر آتے اور جاتے رہے۔ میں نے جن سربراہان کے ساتھ کام کیا ہے وہ سب اب اس دنیا سے رخصت ہو چکے ہیں۔ البتہ ان کے ساتھ کام کرنے والوں کی ایک بڑی تعداد ابھی زندہ ہے اور وہ سب ان واقعات کی صحت کے گواہ ہیں جو میں صرف اس لئے بیان کر رہا ہوں کہ یہ سب تاریخ کی شہادت ہیں۔

میں نے اپنی ملازمت کا آغاز دہلی میں ڈائریکٹریٹ آف کانٹریکٹ میں ۱۹۴۱ء

میں کیا۔ تھوڑے ہی عرصہ بعد میں فوڈ ڈیپارٹ میں ڈپٹی سیکریٹری ایس۔ ایم یوسف صاحب کا پی اے مقرر ہوگیا۔ مگر کچھ ہی عرصہ بعد وہ ٹریننگ پر باہر چلے گئے۔ جس کے بعد مجھے فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے جوائنٹ سیکریٹری کے ڈبلیو۔ پی مرار آئی۔ سی۔ ایس کے ساتھ کام کرنے کے لئے بھیج دیا گیا۔ جہاں میں نے ۱۹۴۷ء تک کام کیا۔

کچھ عرصہ عارضی طور پر میں نے سرجی۔ وی سری واستوا فوڈ منسٹر کے ساتھ بھی کام کیا۔ میری ڈیوٹی ان کی کوٹھی پر تھی۔ ان کی دو بیٹیاں جو کہ بہت ہی ماڈرن تھیں ان سے بھی میرا سابقہ رہتا تھا ایک روز فیملی ٹیلر ماسٹر صاحب آگئے اور دونوں بیٹیوں نے اپنے بلاؤز کا ناپ ان کو دیا اور مجھ سے تاکیداً کہا کہ مسٹر زبیری آپ ناپ دینے کے دوران موجود رہیں۔ چنانچہ مجھے ان کا حکم ماننا پڑا۔

ایس۔ ایم یوسف صاحب بڑے سخت مگر بڑے ایماندار آدمی تھے۔ ایک سردار جی اس زمانے میں کنٹرولر آف راشننگ مقرر ہوئے۔ یہ محکمہ فوڈ ڈیپارٹمنٹ کے ماتحت تھا۔ سردار جی نے کنٹرولر ہونے کے بعد دونوں ہاتھوں سے ناجائز پیسہ کمانا شروع کر دیا ایس ایم یوسف صاحب کو انکوائری آفیسر مقرر کیا گیا۔ انہوں نے انکوائری کرنے کے بعد سردار جی کو ملازمت سے برخاست کرنے کی سفارش کی سردار جی اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ انہوں نے خودکشی کر لی۔ اس کے نتیجے میں سکھوں اور ہندوؤں نے بڑا ایجی ٹیشن کیا اور یوسف صاحب کو جان سے مار دینے کی کوشش کی گئی۔ مگر ان کے ایک ہندو ایماندار دوست نے جو آئی۔ سی۔ ایس آفیسر تھے۔ اپنے گھر میں چھپائے رکھا۔

کچھ عرصہ بعد ایجی ٹیشن ختم ہوگیا اور معاملہ رفع دفع ہوگیا۔

پاکستان بن جانے کے بعد دیگر مسلمان افسران کی طرح میں نے بھی پاکستان میں ملازمت کو ترجیح دی اور لیاقت علی خان کے حکم کے مطابق دیگر افسران کے ہمراہ پہلی ستمبر ۱۹۴۷ء کو بذریعہ ہوائی جہاز کراچی پہنچا۔ میں اس وقت اپنے اہل خانہ کو دہلی میں چھوڑ آیا تھا کیونکہ لیاقت علی خان نے اپیل کی تھی کہ چونکہ کراچی میں کوارٹرز کی کمی ہے اس لئے فی الحال لوگ اپنی فیملی کو ساتھ نہ لے جائیں۔

میری بیگم کے تائے اس زمانے میں دہلی میں محلہ لال کنوئیں میں رہتے تھے جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس لئے میری بیگم اور بچے ان کے پاس رک گئے۔

میری روانگی کے چند گھنٹے بعد دہلی میں مسلمانوں کا قتل عام شروع ہوا۔ میری فیملی بھی اس کی زد میں آگئی تھی مگر خدا نے انھیں بچا لیا۔ طے یہ ہوا تھا کہ وہ دہلی سے علی گڑھ چلی جائیں گی۔ مجھے کراچی میں کچھ پتہ نہ چل سکا کہ وہ لوگ دہلی سے نکل سکے یا نہیں۔ اس کی وجہ سے میں سخت پریشان تھا۔

بہر حال کراچی پہنچ جانے کے بعد مجھے ایس ایم یوسف نے اپنے پاس بلوالیا ان دنوں چودھری محمد علی سیکریٹری جنرل مقرر ہوئے تھے۔ ان کے پی اے حکیم الدین اپنی فیملی کو لینے ایسٹ پنجاب گئے ہوئے تھے۔ اس لئے ایس ایم یوسف نے مجھے عارضی طور پر چودھری محمد علی کے پاس بھیج دیا اور اس طرح مجھے کچھ عرصہ ان کے ساتھ کام کرنے کا بھی موقع ملا۔

چودھری محمد علی نہایت لائق اور بہت محنتی آدمی تھے۔ وہ صبح ۹ بجے دفتر آجاتے اور رات کے ۹ بجے تک برابر کام کرتے رہتے تھے۔ چودھری محمد علی ہر کام میں بہت

جلدی کرتے تھے اور ان کا تکیہ کلام Frightfully quickly تھا۔

اس زمانے میں ساز و سامان کے بٹوارے کے سلسلے میں لیاقت علی خاں اور پنڈت نہرو کے درمیان خط و کتابت ہو رہی تھی۔ یہ سارے خط چودھری صاحب مجھ ہی سے لکھواتے تھے۔ اس طرح میں بھی ان کے ساتھ صبح سے رات تک بے حد مصروف رہتا تھا۔

مجھے ابھی تک اپنے اہل خانہ کی کوئی خبر نہیں ملی تھی۔ اس لئے میں ہر وقت پریشان رہتا تھا۔ اسی دوران میں ایک روز زاہد حسین صاحب جو ہندوستان میں پاکستان کے ہائی کمشنر مقرر ہوئے تھے چودھری صاحب سے ملنے آگئے چنانچہ اس موقع سے فائدہ اٹھا کر میں ان سے ملا اور اپنی پریشانی کا ان سے ذکر کیا انھوں نے میری مدد کرنے کا وعدہ کیا۔ میں نے انھیں پانچ سو روپیہ دیئے اور درخواست کی کہ وہ یہ رقم جلد از جلد میری فیملی کو دہلی پہنچوا دیں اور خیریت معلوم کر کے مجھے خط بھجوا دیں۔

اگرچہ زاہد حسین زاہد خشک مشہور تھے مگر انھوں نے میرے اس کام میں دلچسپی لی اور میرے گھر والوں کی خیریت معلوم کر کے ٹیلیفون پر چودھری محمد علی کو بتایا اور رقم بھی ان تک پہنچا دی۔ اس سے مجھے بڑا اطمینان ہو گیا اور میں نے دونوں کا شکریہ ادا کیا۔ میرے خسر جو کہ ریلوے میں ملازم تھے انھوں نے اپنے ایک ہندو ماتحت کے ہاتھ کچھ رقم اور اجناس بھی دہلی بھجوائیں۔

مجھے رہائش کے لیے جیکب لائن میں ایک کوارٹر الاٹ ہو گیا اور دسمبر میں میری فیملی بھی کراچی پہنچ گئی۔

جب چودھری صاحب کے پی۔ اے چھٹی سے واپس آئے تو میں نے سوچا کسی اور جگہ چلا جاؤں۔ مگر چودھری صاحب نے مجھے روک لیا اسی دوران میں عباسی صاحب جو اس وقت جوائنٹ سیکرٹری تھے۔ قائداعظم کے فرسٹ پرائیویٹ سیکرٹری مقرر ہوئے۔ وہ لکھنؤ کے رہنے والے تھے اور بڑے نستعلیق تھے۔ لوگ ان کی بڑی تعریف کرتے تھے مگر وہ قائداعظم سے بہت ڈرتے تھے۔ جب بھی قائداعظم انہیں بلاتے تھے تو وہ باقاعدہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے ہوئے ان کے پاس جاتے تھے۔ ان کے ڈرنے کی وجہ سے ظاہر ہے ان میں گھبراہٹ پیدا ہو جاتی تھی نتیجہ یہ ہوا کہ جلد ہی قائداعظم نے چودھری صاحب سے کہا کہ ان کی جگہ کوئی دوسرا آدمی انہیں دیا جائے۔ چنانچہ چودھری محمد علی نے یوسف صاحب کا انتخاب کیا۔ حالانکہ یوسف صاحب اس وقت ڈپٹی سکریٹری تھے۔ مگر ان میں ایک اچھے افسر کی تمام خوبیاں موجود تھیں۔ نہایت قابل، کم گو اور ذہین تھے۔ ان کی شخصیت بہت اچھی تھی اسٹاف پر بڑے مہربان تھے اگر یہ کہا جائے کہ He had both the qualities of head and heart تو بالکل صحیح ہوگا۔

وہ چونکہ مجھ سے اچھی طرح واقف تھے اس لئے انہوں نے چودھری محمد علی سے جلد ہی بات کر کے مجھے اپنے پاس بلوا لیا اور اس طرح میں فروری ۱۹۴۸ء کو دیوان صدر یا گورنر جنرل سکرٹریٹ پہنچ گیا۔ یوسف صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے۔ انہوں نے نہ صرف یہ کہ مجھے اپنے ساتھ دوبارہ کام کرنے کا موقع دیا بلکہ اسپیشل پے بھی دلوائی۔ پھر بعد میں میری ترقی سیکشن گریڈ میں ہو گئی۔

یوسف صاحب قائداعظم کی تمام تقاریر لکھا کرتے تھے اور لکھ کردہ ڈرافٹ قائداعظم کے پاس بھیج دیا کرتے تھے۔ کبھی کبھی قائداعظم اس میں کچھ تبدیلی کر دیتے تھے ورنہ وہ درست سمجھا جاتا تھا۔

Work, Work, Work والی مشہور تقریر بھی یوسف صاحب نے ہی لکھی تھی

کبھی کبھی قائداعظم یوسف صاحب کو اپنے پاس بلا کر تقریر لکھنے کے لئے کچھ نکات دیتے تھے جو وہ جلدی جلدی نوٹ کرتے تھے جس میں ان کو دقت پیش آتی تھی۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اب مجھے شارٹ ہینڈ بھی سیکھنا پڑے گی۔

قائداعظم کی آخری تقریر جو انہوں نے اسٹیٹ بینک میں کی تھی۔ وہ بھی یوسف صاحب نے ہی لکھی تھی۔ جب وہ قائداعظم کو بھیجی گئی تو انہوں نے اس پر لکھا Show it to Zahid Hussain یہ زاہد حسین کو دکھا دیجئے۔ زاہد حسین اسٹیٹ بینک کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ جب وہ ڈرافٹ ان کے پاس بھیجا گیا تو انہوں نے اس پر لکھا۔

Excellent draft

ایک مرتبہ کے ایچ خورشید جو قائداعظم کے پرسنل سکریٹری تھے اپنی فیملی کو لینے کشمیر چلے گئے جہاں وہ پھنس گئی تھی۔ ان کی غیر موجودگی میں قائداعظم کو کوئی ضروری نوٹ لکھوانا تھا جو وہ خود Dictate کرانا چاہتے تھے چنانچہ یوسف صاحب مجھے بھی اپنے ساتھ قائداعظم کے پاس لے گئے۔ قائداعظم سے یہ میری پہلی ملاقات تھی۔ یوسف صاحب نے ان سے میرا تعارف کرایا۔ یوسف صاحب نے کہا یہ کئی سال سے میرے ساتھ کام کر رہے ہیں۔ اور بہت لائق آدمی ہیں۔ قائداعظم کا کچھ رعب ایسا تھا کہ اچھے اچھے ان کے پاس

جاتے ہوئے گھبراتے تھے۔ مجھے یہ کہنے میں کوئی عار نہیں کہ اس وقت ان کے سامنے یقیناً خوف زدہ تھا۔ وہ اس وقت ایک بہت لمبی سی میز کے ایک جانب بیٹھے تھے۔ انہوں نے ایک جملہ بولا۔ مگر فوراً ہی انہیں احساس ہوا کہ ہم دونوں کے درمیان کافی فاصلہ تھا اور اس بات کا امکان تھا کہ میں ان کی کوئی بات پوری طرح نہ سن سکوں چنانچہ انہوں نے مجھ سے کہا My boy come closer to me

چنانچہ میں اٹھ کر ان کے قریب سائڈ میں بیٹھ گیا۔ انہوں نے صرف ایک صفحہ کا نوٹ لکھوایا۔ جو میں نے جلد ہی ٹائپ کر کے یوسف صاحب کو دکھلایا اس کے بعد اسے دوبارہ نہایت صاف ستھرا ٹائپ کر کے قائد اعظم کے پاس بھجوایا۔ جب تک وہ دستخط ہو کر واپس نہیں آیا۔ سچ یہ ہے کہ میرا دل زور زور سے دھڑکتا رہا۔ مگر خدا نے میری لاج رکھی۔ جب تک قائد اعظم نے اس پر دستخط کر کے واپس نہ بھیج دیا اس وقت تک مجھے اطمینان نہ ہوا۔ مجھے یہ فخر ہے کہ قائد اعظم کی تمام تقاریر میں ٹائپ کیا کرتا تھا۔

قائد اعظم کے متعلق مشہور ہے کہ وہ ہمیشہ انگریزی میں گفتگو کیا کرتے تھے یہاں تک کہ سلام بھی انگریزی زبان میں ہی ہوتا تھا۔ اس میں اتنی حقیقت ضرور ہے کہ وہ پاکستان بننے سے پہلے انگریزی میں گفتگو کرتے تھے مگر پاکستان بن جانے کے بعد انہوں نے آہستہ آہستہ اردو بولنا شروع کر دی تھی۔ بالکل یہی حال یوسف صاحب کا بھی تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے وہ بھی صرف انگریزی میں گفتگو کرتے تھے بعد میں اردو میں بات چیت کرنے لگے۔

قائد اعظم کی ایک خاص بات یہ تھی کہ وہ جب بھی دورے پر جاتے تھے تو ان کے ساتھ بہت ہی کم اسٹاف ہوتا تھا۔ ایک اے ڈی سی' ایک ذاتی ملازم اور

اسٹاف ممبرز میں سے کوئی ایک۔ اکثر فرخ امین جوان کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکریٹری تھے۔ ان کے ہمراہ جایا کرتے تھے۔ یوسف صاحب کو اپنے پیچھے اپنے سکریٹریٹ کا کام کرنے کے لئے چھوڑ جایا کرتے تھے۔

پاکستان بننے سے پہلے انگریز گورنر جنرل کے زمانے تک گورنر جنرل ہاؤس کے کچن کا اسٹاف اور خرچ بہت زیادہ ہوا کرتا تھا۔ قائداعظم نے یہ سارے معاملات مس جناح کے سپرد کر دیئے تھے انہوں نے انتظام سنبھالتے ہی کمپٹرولر ہاؤس ہولڈ کے اسٹاف میں بہت کمی کر دی اور وہاں کام کرنے والے بہت سے ملازمین کو دوسرے دفتروں میں تبدیل کر دیا گیا۔ جو بھی کھانا وغیرہ پکتا تھا وہ خود دیکھتی تھیں اور اس کا حساب کتاب بھی خود رکھتی تھیں۔ مس جناح ذرا سخت مزاج مشہور تھیں۔ گو مجھے اس کا ذاتی طور پر تو کوئی تجربہ نہیں البتہ مجھے یہ ضرور معلوم ہوا کہ اپنے بھائی کی طرح بہت اصولی اور وقت کی بڑی پابند تھیں۔

قائداعظم کبھی کسی کو تعریفی سرٹیفکیٹ نہیں دیتے تھے۔ اس سلسلے میں سید مجاہد حسین نے جو قائداعظم کے اسٹینوگرافر تھے نے اپنی یادداشتوں میں ایک جگہ لکھا ہے۔

ایک دفعہ میں نے کسی جگہ ملازمت کے لئے درخواست دی لیکن ایک اور امیدوار کی کسی بڑے آدمی نے سفارش کی اور اس کا انتخاب ہو گیا کچھ دنوں بعد فیڈرل کورٹ میں اسٹینو کی ایک آسامی نکلی اس زمانے میں اسٹینوگرافر کی مانگ بہت زیادہ نہیں تھی اور مسلمانوں کو تو کوئی پوچھتا بھی نہیں تھا۔ میں نے قائداعظم سے درخواست کی کہ وہ سر شاہ محمد سلیمان سے میری سفارش کر کے میری تقرری وہاں کرادیں قائداعظم

یہ سن کر بہت ناراض ہوئے اور بولے تمہیں یہ جرأت کیسے ہوئی۔ تم اگر میرے بیٹے بھی ہوتے تو میں تمہاری سفارش نہ کرتا۔ پھر انہوں نے کہا، تمہیں شاید علم نہیں کہ حکومت نے میری سفارش حاصل کرنے کے لئے کیسی کیسی چالیں چلیں ہیں۔ مگر پھر یہ محسوس کر کے کہ ان کے سخت رویئے سے میری دل آزاری ہوئی ہے قائد اعظم نے ایک واقعہ سنایا۔ انہوں نے فرمایا کہ جب انڈین آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس کا محکمہ قائم ہوا تو برطانوی حکومت کے فنانس ممبر سر بریکٹ اس کے نگراں تھے۔ میں ان دنوں اسمبلی میں آزاد پارٹی کا لیڈر تھا۔ سر بریکٹ کو کسی معاملے میں میری پارٹی کی حمایت کی ضرورت تھی چنانچہ وہ ایک دن میرے پاس آئے اور کہا کہ آڈٹ اینڈ اکاؤنٹس سروس کے لئے مسلمان نہیں مل رہے ہیں۔ آپ دو چار مسلمانوں کے نام دیں تاکہ انہیں ملازم رکھ لیا جائے۔ ظاہر ہے کہ ان کا مقصد میری سفارش حاصل کرنے کے بعد مجھے مجبور کرنا تھا کہ میں اسمبلی میں حکومت کی حمایت کروں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ فنانس ممبر ہیں۔ آدمیوں کو ڈھونڈنا آپ کی ذمہ داری ہے۔ میری نہیں۔ قابل مسلمانوں کی کمی نہیں۔ لیکن ان تقرریوں سے میرا کوئی سروکار نہیں اس سخت رویئے پر سر بریکٹ خاموش ہو کر رہ گئے اور انہیں مزید کچھ کہنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ پھر قائد اعظم نے مجھ سے کہا کہ سفارش

ایسی چیز ہے جو آدمی کو ذلیل و خوار کراتی ہے۔ اگر کچھ
بننا چاہتے ہو تو اپنی صلاحیت اور محنت سے بنو۔

آخری دنوں میں جب قائد اعظم کی طبیعت کچھ زیادہ خراب ہو گئی تھی تو وہ
اگست ۱۹۴۸ء میں کوئٹہ چلے گئے جہاں دو چار دن قیام کرنے کے بعد زیارت منتقل ہو گئے
انھیں زیارت بہت پسند تھا کیونکہ وہ ایک الگ تھلگ جگہ ہے۔ وہاں صنوبر کے
گھنے درخت ہیں اور وہ ایک نہایت ہی پر فضا مقام ہے۔ زیارت میں چند دن رہنے
سے ان کی صحت پر اچھا اثر پڑا اور ان کی طبیعت سنبھلنے لگی لیکن اسٹیٹ بنک کے افتتاح
کے سلسلے میں انھیں کراچی جانا پڑا جب وہ دوبارہ زیارت پہنچے تو اور بھی زیادہ کمزور ہو گئے
تھے اس کی وجہ شاید کام کی زیادتی تھی۔

کراچی سے باقاعدہ روزانہ کوریر سروس سے ڈاک اور فائلیں آتی اور جاتی تھیں
اس وقت ان کے ذاتی معالج کرنل ایس بی شاہ تھے۔ وہ مقررہ وقت پر روزانہ ان کے پاس آتے
اور بارہ بجے دوپہر کام ختم کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ وہ زیارت ریذیڈنسی کی ایک بالکونی
میں ایک مخصوص نشست پر بیٹھا کرتے تھے کیونکہ انھیں وہاں سے سامنے نظر آنے والا
خوبصورت منظر بہت پسند تھا۔

قائد اعظم کے پھیپھڑے جواب دے چکے تھے۔ ان کی حالت دن بہ دن خراب
ہوتی جارہی تھی۔ جب آخری مرتبہ وہ زیارت سے کوئٹہ جا رہے تھے تو انھیں اوپر
سے اسٹریچر پر لایا گیا اور یہ بات تو ہر شخص کو معلوم ہے کہ اس وقت انھوں نے حکم
دے دیا تھا انھیں اسٹریچر پہ لے جاتے ہوئے اس بات کا خیال رکھا جائے کہ کوئی
انگریز ان کی یہ حالت نہ دیکھے اس وقت ریذیڈنسی میں صرف ایک ہی انگریز تھا۔
ایس ڈی ایم اسکاٹ جو پولیس کپتان تھا اور سیکورٹی کا انچارج تھا۔ اس وقت
اسے یہ کہہ کر باہر بھجوا دیا گیا کہ قائد اعظم آنے والے ہیں وہ باہر جا کر سیکورٹی چیک کرے

وہ سمجھدار آدمی تھا۔ بے چون وچرا چلا گیا۔ جب قائداعظم کو کار میں بٹھایا گیا تو انہوں نے کہا مجھے اس طرح بٹھاؤ کہ میں اپنے عوام کو دیکھ سکوں۔

جب زیارت سے وہ اپنے آخری سفر پر روانہ ہو رہے تھے تو انہوں نے کار کے اندر سے ہاتھ ہلا ہلا کر لوگوں کو خدا حافظ کہا۔

قائداعظم کی کوئٹہ سے روانگی سے چند گھنٹے قبل قائداعظم کے ڈاکٹروں نے مس جناح سے کہہ دیا تھا کہ اب قائداعظم کے بچنے کی ایک فی صد امید بھی نہیں اور چوبیس یا بہت سے بہت چھتیس گھنٹے بھی اگر وہ زندہ رہ جائیں تو بہت ہے۔ جہاز میں قائداعظم کے ساتھ دو ڈاکٹر کرنل الٰہی بخش اور کرنل ایم۔ ایچ شاہ تھے۔

قائداعظم کو کراچی میں گورنمنٹ ہاؤس پہنچا دیا گیا۔ انھیں آرام سے بستر پر لٹانے کے بعد دونوں ڈاکٹر کراچی کلب چلے گئے جہاں اس وقت گورنر سندھ سر غلام حسین ہدایت اللہ کے اعزاز میں ایک دعوت ہو رہی تھی۔ تقریباً رات کے دس بجے گورنمنٹ ہاؤس سے کلب میں ایک فون موصول ہوا دونوں ڈاکٹروں کو فوراً طلب کیا گیا تھا۔ انھوں نے وہاں پہنچ کر قائداعظم کو ایک انجکشن دیا۔ اس وقت ان کا دل ڈوب رہا تھا۔ انجکشن کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور ایک گھنٹہ کے بعد ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی۔ ان کے انتقال کی خبر ریڈیو سے نشر ہو گئی اور فوراً ہی لوگوں نے گورنمنٹ ہاؤس کے قریب جمع ہونا شروع کر دیا۔

ریڈیو سے اعلان کر دیا گیا کہ ان کو تین بجے دوپہر دفن کیا جائے گا۔ ان کے دفن کرنے کے لئے یہ جگہ اس وقت کے کمشنر کراچی ہاشم رضا ساری رات کراچی کے مختلف علاقوں کا چکر لگانے کے بعد منتخب کر چکے تھے۔ ان کے جسد خاکی کو دفن کرتے کی

تیاری میں زیادہ وقت لگا کیونکہ ان کا جنازہ شیعہ طریقے پر تیار کیا گیا۔ اس کے بعد ان کی میت کو گورنمنٹ ہاؤس میں داخل ہوتے والے راستے کی سیڑھیوں پر عوام کے آخری دیدار کے لئے رکھ دیا گیا۔

دفن میں کچھ دیر اور لگی کیونکہ ان کی صاحب زادی دینا نے بمبئی سے ٹیلیفون کیا کہ وہ ایک چارٹرڈ ہوائی جہاز سے پہنچ رہی ہیں اور ان کے آنے تک قائد اعظم کو دفن نہ کیا جائے۔ گو کہ مس جناح چاہتی تھیں کہ دفن جلد از جلد کر دیا جائے خواہ دینا اس وقت پہنچ سکیں یا نہیں لیکن فیصلہ یہی کیا گیا کہ جب وہ آرہی ہیں تو ان کے پہنچنے کا انتظار کرنا چاہیئے۔

ان کے جنازے کی نماز مولانا شبیر احمد عثمانی نے پڑھائی۔ قائد اعظم کی صاحبزادی دینا اپنے والد کی طرح زیادہ دراز قد نہیں مگر ان کے نقوش بالکل باپ کی طرح ہیں اور بالکل انہی کی طرح بات کرتے وقت گردن ایک سمت تھوڑی سی جھکا کر اور مخاطب کی طرف انگشت شہادت اٹھا کر گفتگو کرتی ہیں۔

جب قائد اعظم میموریل فنڈ قائم ہوا اس وقت میں سیکرٹری کا پی اے تھا۔ اس فنڈ کے سلسلے کی تمام خط و کتابت میرے ذمہ تھی۔

قائد اعظم میموریل فنڈ اور ان کے مقبرے کی تعمیر سے ایوان صدر کے کچھ افسران نے خوب فائدے اٹھائے اور خوب ہاتھ رنگے۔ وہ زمانہ اچھا تھا اس لئے ان کے خلاف انکوائری بھی ہوئی اور کچھ افسران کو سزائیں بھی ملیں۔

شیخ عبدالقادر نے ایک جگہ لکھا ہے۔

"پرانے زمانے کے اطالیہ میں ایک عجیب و غریب رسم تھی کہ کسی مرنے والے کے عزیزوں اور دوستوں کے آنسو جمع کیے جاتے تھے۔ مرنے والے کے ماتم میں اس کے جو دوست شریک ہوتے تھے وہ اپنے اپنے آنسو شیشیوں

میں ٹپکاتے تھے اور جس کے مرنے پر بہت سی شیشیاں آنسوؤں سے پر ہوتی تھی ان کی تعداد کی کثرت اس کی ہر دل عزیزی کا معیار ہوتی تھی اگر ہماری قوم میں کوئی ایسا ہی رواج ہوتا اور وہ سب آنسو جو مسلمانوں نے جابجا قائداعظم کی اندوہ گیں وفات پر بے اختیار بہائے جمع کئے جا سکتے۔ تو ایک طوفان اشک بپا ہو جاتا۔"

خواجہ ناظم الدین

قائداعظم کی وفات پوری قوم کے لئے ایک بہت ہی بڑا سانحہ تھا، گو وہ قوم سے جدا ہو گئے۔ لیکن قوم نے " قائداعظم زندہ باد " کا نعرہ لگا کر انہیں ہمیشہ کے لئے زندۂ جاوید بنا دیا ہے۔

قائداعظم کے دفن سے پہلے کیبنٹ کا اہم اجلاس ہوا جس میں یہ فیصلہ کیا جانا تھا کہ اب قائداعظم کے بعد گورنر جنرل کس کو بنایا جائے اس اجلاس میں مسلم لیگ کے صدر چودھری خلیق الزماں اور سندھ کے چیف منسٹر کو مدعو کیا گیا مسٹر ظفراللہ خاں نے تجویز پیش کی۔ لیاقت علی خاں گورنر جنرل بن جائیں۔ اس پر انہوں نے کہا کہ پارلیمانی جمہوریت میں اصل طاقت وزیراعظم کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اگر ممبران انہیں وزیراعظم کے عہدے سے ہٹانا چاہتے ہیں تو پھر وہ اس کے لئے تیار ہیں۔ چودھری خلیق الزماں نے ایک مرتبہ قائداعظم کو مشورہ دیا تھا کہ نواب بھوپال کو کیبنٹ میں شامل کر لیا جائے اور انہیں دفاع کا محکمہ دے دیا جائے۔ چنانچہ خلیق الزماں نے تجویز پیش کی کہ نواب صاحب سے بات کی جائے اور اگر وہ

راضی ہو جائیں تو انہیں گورنر جنرل بنا دیا جائے۔ مگر لیاقت علی خاں اور نشتر نے اس رائے سے بھی اتفاق نہیں کیا۔ اس کے بعد لیاقت علی خاں نے خواجہ ناظم الدین کا نام تجویز کیا اور اس پر سب لوگوں نے اتفاق کر دیا (سر غلام حسین ہدایت اللہ گورنر سندھ کو نہ معلوم کیوں اس کا پختہ یقین تھا کہ قائد اعظم کی وفات کے بعد وہی گورنر جنرل بنیں گے۔ مگر ایسا نہ ہوا۔ اور وہ اپنے گورنر جنرل نہ بننے کے فیصلے سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ تجہیز و تکفین سے واپسی کے بعد پھر وہ چارپائی سے نہ اٹھ سکے اور چند ہی روز بعد راہی ملک عدم ہو گئے) چنانچہ انہیں فوراً ڈھاکے سے طلب کیا گیا بغیر یہ بتلائے ہوئے کہ انہیں کس لئے بلایا گیا ہے۔ یہ کام اس قدر جلد کیا گیا کہ بیچارے خواجہ صاحب کو کپڑے تک تبدیل کرنے کا موقع نہیں ملا اور انہیں حلف اٹھانے کے لئے ایک نئی شیروانی اور جناح کیپ کا بندوبست کرنا پڑا۔ وہ ہمیشہ ترکی ٹوپی پہنا کرتے تھے۔ ایک صحافی نے ان سے دریافت کیا کہ آپ اب جبکہ قائد اعظم کی جگہ لے رہے ہیں تو کیا ترکی ٹوپی پہننا ترک کر دیں گے انہوں نے جواب دیا کہ میں قائد اعظم کی جگہ نہیں لے رہا بلکہ ان کے نقش قدم پر چل رہا ہوں اور زندگی بھر چلتا رہوں گا۔

خواجہ صاحب قائد اعظم کے بہت قریب رہے تھے اور ان کا جنازہ بہت صحیح ہوا تھا افسوس یہ ہے کہ خواجہ صاحب کو لوگوں نے کبھی سمجھا ہی نہیں اور ان کی صلاحیتوں کا بھی صحیح اندازہ نہیں لگایا گیا۔ وہ ٹرینٹی اور کیمبرج کے پڑھے ہوئے تھے کھیلوں کے شوقین تھے ان کا نشانہ بہت اچھا تھا۔ لیاقت علی خاں ان کی بڑی عزت کرتے تھے اور ان کے لئے کار کا دروازہ تک کھولتے تھے خواجہ صاحب بھی لیاقت علی خاں کی بہت عزت کرتے تھے اور شاید اسی وجہ سے ان دونوں میں کبھی اختلاف نہیں ہوا۔ جب خواجہ ناظم الدین گورنر

جنرل بن کر گورنر جنرل ہاؤس میں آ گئے تو بہت سے لوگوں کا خیال تھا کہ وہ ذاتی عملہ تبدیل کریں گے اور اپنا ذاتی عملہ رکھیں گے مگر انہوں نے کوئی تبدیلی نہیں کی اور چند ہی روز میں تمام عملے سے ذاتی ملاقات پیدا کر لی اور ان کو علم ہو گیا کہ کون کیا کرتا ہے۔ وہ نہایت ہی شریف النفس انسان تھے اور بہت نرمی سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ انہیں انشاء اللہ بولنے کی بہت عادت تھی ان کی تقاریر بھی یوسف صاحب پہلے انگریزی میں لکھتے تھے پھر الفار میشن والے اس کا اردو ترجمہ کر کے ان کے پاس بھجوا دیتے تھے۔ انہیں شکار کا بہت شوق تھا ہر قسم کا شکار یعنی مچھلی، مرغابی وغیرہ کرتے تھے مجھے بھی ایک مرتبہ ان کے ساتھ مشرقی پاکستان میں شکار پر جانے کا اتفاق ہوا دسمبر کا مہینہ تھا وہ مشرقی پاکستان ٹور پر گئے ہوئے تھے ان کے ساتھ اس وقت یوسف صاحب، ان کا ذاتی ملازم گن مین اور میں بھی تھا۔ انہوں نے وہاں شکار کا پروگرام بنایا ہم لوگ علی الصبح ایک کھلی ہوئی کشتی میں نارائن گنج سے روانہ ہوئے وہ خود تو شیروانی اور اس کے اندر دو سوئیٹر پہنے ہوئے تھے مگر چونکہ مجھے موسم کا صحیح اندازہ نہیں تھا صرف سمر کسوٹ پہنے تھا۔ جوں جوں ہم دریا میں آگے بڑھے سردی بڑھتی گئی یہاں تک کہ میں سردی سے کانپنے لگا۔

خواجہ صاحب نے مجھے دیکھ کر فوراً میری حالت کا اندازہ کر لیا کہنے لگے "زبیری صاحب آپ کو سردی لگ رہی ہے۔ آپ میرا اوور کوٹ پہن لیجئے۔ وہ بہت موٹے اور میں بہت دبلا... بھلا ان کا اوور کوٹ میرے کب ٹھیک آتا۔ یوں بھی یہ اچھا نہ تھا کہ میں گورنر جنرل کا اوور کوٹ پہن لوں۔ یوسف صاحب نے بھی کہا کوئی حرج نہیں پہن لیں آخر ان کے ملازم نے ان کا اوور کوٹ میرے کندھوں پر ڈال دیا اس طرح میں سردی سے محفوظ رہا۔ اس بات سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ ہر شخص کا کتنا خیال رکھتے تھے ایک مرتبہ ہم لوگ مشرقی پاکستان کے گورنر کے جہاز "میری اینڈرسن" کے ذریعہ نارائن گنج سے واپس آ رہے تھے یوسف صاحب نے ایک تقریر کا مسودہ جو خواجہ صاحب کو ڈھاکہ میں کرنا

تھی جہاز پر ہی بھیج دیا تھا۔ وہ انہوں نے دیکھا اور مجھے کیبن میں بلوایا کئی جگہ ان شاء اللہ
لکھوایا۔ اور ایک دو پیراگراف اور لکھوائے اس دوران میں بیرا دو کپ کافی لے
آیا۔ وہ کافی پینے لگے۔ میں لکھتا رہا۔ انہوں نے دیکھا میں کافی نہیں پی رہا تو کہنے لگے
زبیری صاحب آپ پہلے کافی پی لیں۔ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ تقریر تو بعد میں
بھی مکمل ہو جائے گی۔

خواجہ صاحب کے بارے میں لوگوں نے مشہور کر دیا ہے کہ وہ کھانے کے بہت
شوقین تھے اور بہت زیادہ کھاتے تھے۔ بلکہ یہ بات یہاں تک مشہور ہو گئی تھی کہ لوگوں
نے ان کا لقب ہی قائد قلت رکھ دیا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں ملک میں گیہوں کی کچھ قلت
ہو گئی تھی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کے زمانے میں گورنر جنرل ہاؤس میں پارٹیاں
بہت ہوتی تھیں مگر وہ خود زیادہ نہیں کھاتے تھے بلکہ دوسروں کو کھلا کر خوش ہوتے تھے
ان کا حکم تھا کہ پورے ماہ رمضان میں روزہ کھولنے کے وقت اسٹاف کے جو بھی ممبرز
وہاں موجود ہوں وہ سب ان کے ساتھ روزہ کھولیں چنانچہ روزانہ لان پہ فرش بچھا کر
افطاری وغیرہ کا انتظام کر دیا جاتا تھا۔ افطاری کے بعد سب لوگ باجماعت نماز ادا کرتے
تھے۔ اس کی امامت دفتر کا ایک چپراسی ملا نظیر کرتا تھا اور خواجہ صاحب بھی اس کے پیچھے
نماز پڑھتے تھے۔

اصل میں تین ہستیاں ان کے بہت خلاف تھیں۔ اس میں غلام محمد، چودھری محمد علی اور
گورمانی شامل تھے۔ یہ تینوں ٹرائیکا کے نام سے مشہور تھے اور یہی لوگ خواجہ صاحب کے خلاف
مختلف قسم کا سازشی پروپیگنڈہ کرتے رہتے تھے۔

مجھے بھی ایک دو دفعہ ان پارٹیوں میں شریک ہونے کا موقع ملا۔ ایک مرتبہ ایک روسی
مسلمان منطیک جو بعد میں اپنے آپ کو بیگ لکھنے لگے تھے ایوان صدر میں کمپٹرولر تھے اور
خواجہ صاحب کے گھریلو امور کے انچارج تھے انہوں نے ڈھاکے میں ایک ڈنر کا انتظام کرایا۔

اس میں زیادہ تر اسٹاف کے ممبران شامل تھے۔ اسٹاف کے علاوہ بھی کچھ لوگ مدعو تھے مثلاً مختار زمن صاحب وغیرہ کھانے میں خشک کوفتے نما کوئی چیز تھی۔ اس میں سے ایک کوفتہ اٹھا کر میں نے اپنی پلیٹ میں رکھ لیا۔

خواجہ صاحب مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ چپکے سے مجھے بلا کر ایک طرف لے گئے اور کہنے لگے۔ "زبیری صاحب یہ کوفتہ نہیں ہے بلکہ میٹھا ہے۔"

میں اس وقت بڑا شرمندہ ہوا اور ان کا شکریہ ادا کیا۔

وہ ایک نہایت کشادہ دل انسان تھے۔ اور دل کے بادشاہ تھے۔

ایک روز انہوں نے مجھے بلایا اور کہنے لگے۔

"زبیری صاحب آپ کے خیال میں میرے بینک میں کتنا پیسہ ہوگا؟"

میں کیا جواب دیتا، چپ رہا۔

پھر کہنے لگے "مجھے اپنے کزن کو ایک خط لکھوانا ہے۔ جو ڈھاکہ میں رہتا ہے۔ مگر یہ خط میرے اور آپ کے درمیان راز رہے گا۔"

انہوں نے خط میں لکھوایا کہ میرے مالی حالات خاصے خراب ہیں۔ (حالانکہ وہ اس وقت پاکستان کے گورنر جنرل تھے) حکومت سے جو کچھ ملتا ہے وہ سب خرچ ہو جاتا ہے۔ بلکہ میرے اپنے پاس جو تھوڑا بہت اثاثہ تھا وہ بھی خرچ ہو چکا ہے۔ میرا بینک بیلنس صفر ہے۔ لہٰذا آپ فوراً دس ہزار روپیہ کا ایک ڈرافٹ مجھے بھیج دیں۔

جب یہ خط میں لکھ چکا تو انہوں نے اپنی جیب سے پانچ روپے کا نوٹ نکال کر مجھے دیا اور کہا۔

"یہ میرا ذاتی خط ہے اسے رجسٹری کرا دیجئے۔ یہ خط سرکاری خرچ پر نہ بھیجیں اور کسی سے بھی اس کا ذکر نہ کریں۔"

اور جب وہ خط ٹائپ ہو گیا تو اس کی آفس کاپی اپنے پاس رکھ لی۔

انہیں اپنی بیٹی سے بہت محبت تھی۔ اس کی شادی خواجہ شہاب الدین کے لڑکے کرنل وصی الدین سے ہوئی تھی مگر وہ کامیاب ثابت نہیں ہوئی ان میں کچھ عرصہ بعد علیحدگی ہو گئی تھی۔ کرنل وصی الدین بعد میں لیفٹیننٹ جنرل ہو گئے تھے اور انہوں نے ایک کشمیری عورت سے شادی کر لی تھی۔

خواجہ صاحب اکثر ٹور میں اپنی اس بیٹی کو ساتھ لے جایا کرتے تھے ان کے بیٹے کو بھی ان کی طرح شکار اور کرکٹ کا شوق تھا۔ شکار میں وہ اکثر ان کے ساتھ جایا کرتا تھا۔ مگر پڑھنے میں خاصا کمزور تھا اس کی وجہ سے خواجہ صاحب پریشان رہا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ نتھیا گلی میں انہوں نے یوسف صاحب سے کہا کہ میرا نمبر دو بیٹا پڑھنے میں کافی کمزور ہے اس کے لئے کسی اچھے ٹیوٹر کا بندوبست کرا دیں۔ یوسف صاحب نے فرخ امین سے ذکر کیا۔ فرخ امین نے ایک ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر ابراہیم صاحب کو پڑھانے پر مامور کر دیا یہ خورشید ابراہیم کے والد تھے اور ایبٹ آباد میں سکونت پذیر تھے۔ ابراہیم صاحب نے اس لڑکے کو نہایت اچھی طرح تعلیم دی اور ایک ماہ کے اندر ایسی تیاری کرا دی کہ وہ میٹرک میں پاس ہو گیا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اولاد تک کے لئے کسی سے سفارش نہیں کرتے تھے نہ ان میں کسی قسم کا طمع تھا نہ لالچ۔ وہ سیدھے سچے مسلمان تھے نماز اور روزے کے پابند تھے۔ رمضان میں افطار پر اکثر لوگ مدعو ہوا کرتے تھے۔ سلام کرنے میں وہ ہمیشہ پہل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے اس دوران میں کبھی انہیں غصہ کرتے نہیں دیکھا۔ مگر وہ صوبائی تعصب کا شکار رہے اور لوگوں نے ان کے طرح طرح کے نام رکھے۔ مثلاً ہاضم الدین اور قائد قلت وغیرہ۔

۱۶ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو راولپنڈی کے لیاقت باغ میں ایک سر پھرے شخص سید اکبر

نے لیاقت علی خاں کو گولی مار کر اس وقت ہلاک کر دیا جب وہ ایک
جلسے سے خطاب کرنے کھڑے ہوئے تھے۔ ان دنوں خواجہ صاحب اور
اسٹاف کے کچھ ممبران نتھیا گلی ٹور پر تھے، میں بھی ان میں شامل تھا۔ اسی
دن شام کو ہمیں راولپنڈی سے ٹیلی فون پر اطلاع ملی۔ خواجہ ناظم الدین
پر اس کا بہت اثر ہوا۔ اور وہ فوراً جیپ میں راولپنڈی کا روانہ ہو گئے
اور جاتے وقت ہدایت دے گئے کہ پورا اسٹاف اگلے روز صبح بذریعہ
ٹرین کراچی واپس چلا جائے۔ صبح تک ہم لوگوں کو صحیح حالات کا علم نہ ہو سکا
بہر حال لاہور اسٹیشن پر جب اخبارات دیکھے تو ہمیں واقعات کا پتہ چلا
انہی اخبارات کے ذریعہ ہمیں یہ بھی معلوم ہوا کہ خواجہ ناظم الدین کو وزیر اعظم
اور غلام محمد کو گورنر جنرل مقرر کر دیا گیا ہے۔ خواجہ صاحب وزیر
کس طرح بنے اس کی تفصیلات ہمیں بعد میں معلوم ہوئیں جو خود دلچسپی
سے خالی نہیں۔

لیاقت علی خاں کے دفن سے پہلے کراچی میں اس وقت جو وزراء موجود
تھے ان کا فوری اجلاس ہوا۔ زیادہ تر لوگوں کی رائے یہ تھی کہ سردار نشتر کو
وزیر اعظم بنا دیا جائے۔ لیکن خواجہ صاحب کی آمد تک اس فیصلے کو حتمی
شکل نہیں دی گئی۔ رات بھر اس مسئلے پر بات چیت جاری رہی کیونکہ کچھ
لوگ سردار نشتر کو وزیر اعظم بنانے کے مخالف تھے۔ اس رات دو علیحدہ
علیحدہ ہوائی جہازوں کے ذریعے خواجہ صاحب اور نواب مشتاق احمد گورمانی
کراچی پہنچے۔ گورمانی اس زمانے میں کشمیر افیئرز کے منسٹر تھے۔ اگلے روز
صبح باقاعدہ کیبنٹ کی میٹنگ گورنر جنرل ہاؤس میں ہوئی اور جب
اس بات کا اعلان ہوا کہ خواجہ صاحب کو وزیر اعظم اور غلام محمد کو گورنر جنرل

بنا دیا گیا ہے تو لوگوں بڑی حیرت ہوئی۔ شاید یہ فیصلہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی نمائندگی کے لحاظ سے کیا گیا تھا۔

خواجہ صاحب کو وزیر اعظم بنانے کی تجویز کس نے پیش کی یہ بڑا اہم سوال ہے۔ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ سکریٹری جنرل چودھری محمد علی اور خواجہ صاحب کے چھوٹے بھائی خواجہ شہاب الدین نے یہ تجویز پیش کی تھی۔ یہ بھی کہا گیا کہ خواجہ شہاب الدین نے وزراء کو یقین دلایا کہ میں بھائی جان کو گورنر جنرل کا عہدہ چھوڑ کر وزیر اعظم بننے کے لیے آمادہ کر لوں گا لیکن بعد کے واقعات سے پتہ چلتا ہے کہ شہاب الدین نے ایسی کوئی بات نہیں کی۔ دراصل سب سے پہلے یہ تجویز "ڈان" اخبار کے ایڈیٹر الطاف حسین نے پیش کی تھی جس سے فضل الرحمٰن اور چودھری محمد علی نے اتفاق کر لیا۔

لیکن گورمانی صاحب نے بعد میں کھلے عام یہ بات کہی کہ خواجہ صاحب کا نام انہوں نے تجویز کیا تھا اور نشتر کو وزیر اعظم بنانے کی مخالفت کی تھی اسی طرح غلام محمد کو جو اس وقت بھی کافی بیمار تھے گورنر جنرل بنانے کی تحریک فضل الرحمٰن نے پیش کی تھی بلکہ انہوں نے یہاں تک کہا کہ ہم نے غلام محمد کو سونے کی زنجیریں پہنا دی ہیں۔

غلام محمد کو اپنے گورنر جنرل بنائے جانے پر خود بہت حیرت ہوئی تھی۔ وہ اس دن بذریعہ ٹرین راولپنڈی سے کراچی آرہے تھے اور انہیں بذریعہ تار ٹرین میں ہی گورنر جنرل بنائے جانے کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ غلام محمد اس وقت بھی اس قدر بیمار تھے کہ جب ۱۹ اکتوبر ۱۹۵۱ء کو حلف وفاداری اٹھانے کا وقت آیا تو ان کو دو اے ڈی سی پکڑ کر ہال میں لائے تھے۔ یہ لیاقت علی خاں کے سوئم کا دن تھا اسی وقت ہال میں کسی نے کہا: "اب بہت جلد ایک دوسرا سوئم بھی ہوگا۔"

شاید غلام محمد کو گورنر جنرل بنانے میں کچھ لوگ آئندہ وقت میں اپنی تقدیر کے فیصلے دیکھ رہے تھے۔ مگر کچھ ہی عرصے بعد غلام محمد کی صحت کافی بہتر ہو گئی۔ ظاہر ہے اس سے کچھ لوگوں کو خوشی اور کچھ کو بہت دکھ پہنچا۔ تقریباً ۲ سال بعد غلام محمد کی صحت دوبارہ خراب ہو گئی تھی۔ خواجہ ناظم الدین نے وزیر اعظم بن جانے کے بعد لیاقت علی خاں کے زمانے کے تمام وزراء کو کیبنٹ میں شامل رکھا۔ البتہ اس میں ڈاکٹر محمود حسین اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی کو بھی شامل کر لیا۔ خواجہ صاحب کو وزیر اعظم بن جانے کے بعد اس بات کی بڑی فکر تھی کہ جلد از جلد پاکستان کا دستور بن جائے۔

وزیر اعظم بن جانے کے ایک سال کے بعد ہی ان کو دستور کمیٹی کی رپورٹ پیش کر دی گئی جس کا ڈرافٹ سر رابرٹ ڈریٹن نے تیار کیا تھا۔ سر رابرٹ دساتیر پر گہری نظر رکھتا تھا وہ رپورٹ دراصل پورا ایک دستوری مسودہ تھا جس کے سولہ حصے، ۲۵۵ آرٹیکل اور شیڈول تھے۔ ۲۲ دسمبر ۱۹۵۲ء کو یہ رپورٹ دستور ساز اسمبلی کو پیش کر دی گئی۔

اس کی خاص خاص باتیں یہ تھیں۔

(۱) مرکزی حکومت میں ایک اسمبلی اور ایک سینٹ ہو گی اور سب سے بڑی تجویز یہ تھی کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کے ممبران کی تعداد برابر برابر رکھی گئی تھی۔

(۲) سربراہ مملکت مسلمان ہو گا۔

(۳) اسمبلیاں پانچ سال کے لیے منتخب کی جائیں گی۔

(۴) صوبوں میں صرف ایک اسمبلی ہو گی۔

(۵) لیاقت علی خاں کا پیش کردہ "**قرارداد مقاصد**" اس رپورٹ میں بطور "**ابتدائیہ**" شامل کیا گیا تھا۔

(۶) کوئی ایسا قانون نہیں بنایا جائے گا جو قرآن اور سنت کے خلاف ہو۔

(۷) پاکستان کا ایک سپریم کورٹ مقرر کیا جائے گا۔

(۸) دستور میں ترمیم کا طریقہ کار سخت رکھا گیا تھا۔

البتہ خواجہ ناظم الدین نے زبان کے مسئلہ کو اس وقت نہیں چھیڑا کیونکہ اس مسئلہ پر کچھ عرصے قبل ڈھاکہ میں کافی جھگڑے ہو چکے تھے برابر سٹیٹس رکھنے کی سب سے زیادہ مخالفت مشرقی پاکستان میں عطاء الرحمٰن اور شیخ مجیب الرحمٰن نے کی لیکن عام طور پر مشرقی پاکستان کے لیڈران نے ملک کے مفاد میں اس شق کو تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد کے واقعات تاریخ اور سیاسی حقائق ہیں اور اس کتاب کے اصل موضوع سے باہر ہیں۔

غلام محمد

گورنر جنرل بننے کے دو دن بعد غلام محمد اپنے تمام عملے سمیت راولپنڈی روانہ ہو گئے راولپنڈی میں ہم لوگ سرکٹ ہاؤس (اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس) میں مقیم ہوئے۔ لیاقت علی خاں کے قتل کی خبر پر سینکڑوں کی تعداد میں بیرونی ممالک سے تار اور پیغامات آنے شروع ہو گئے اس وقت یوسف صاحب ٹریننگ پر جرمنی چلے گئے تھے اور غلام محمد نے ان کی جگہ انور علی کو جو اس وقت فنانس منسٹری میں جوائنٹ سیکرٹری تھے اپنا سیکرٹری مقرر کر دیا تھا۔ جتنے خطوط اور تار وغیرہ آ رہے تھے ان کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ اس وقت سارا عملہ جوابات تیار کرنے میں مصروف ہو گیا تھا۔ زیادہ تر جوابات انور علی لکھواتے تھے، ساتھ ہی ساتھ سیکرٹریٹ کا کام بھی ہوتا تھا اور ہمیں کام کرتے ہوئے رات کے دو، دو بج جاتے تھے۔

ایک رات ایک شخص ایک تار دینے کے لئے سیدھا اسٹیٹ گیسٹ ہاؤس کے اوپر والے کمرے میں آ گیا جہاں میں رہتا تھا۔ اس وقت رات کے تقریباً تین بجے تھے اس نے ہمیں سوتے سے اٹھا کر تار دیا پڑھا تو معلوم ہوا کہ وہ اسی قسم کے تعزیتی پیغامات میں سے ایک تھا جو ان دنوں مختلف ممالک سے موصول ہو رہے تھے۔ لیکن اس ہرکارے کا بغیر کسی روک ٹوک کے اوپر تک آجانا تعجب کی بات تھی۔ چنانچہ صبح یہ بات انور علی کے علم

میں لائی گئی۔ انہوں نے فوراً سیکورٹی کے عملے کو بلا کر سخت تنبیہہ کی کیونکہ اس طرح تو کوئی بھی شخص ایوان صدر میں کہیں بھی پہنچ سکتا تھا۔ بہرحال اس کے بعد سیکورٹی کافی چوکس کر دی گئی۔

غلام محمد نے گورنر جنرل بننے کے تھوڑے ہی دن بعد اپنے ذاتی عملے میں تبدیلی کرنا شروع کر دی یوں بھی ایوان صدر میں بڑی تبدیلی کا احساس پایا جانے لگا تھا۔ غلام محمد کے دوست احباب بہت سے تھے ان سب کا رات دن آنا جانا شروع ہو گیا۔ ان کے ایک کزن تھے ملک صاحب پنڈی میں ان کی ایک فیکٹری تھی وہ آکر کچھ عرصہ کے لئے شہر میں رہنے لگے۔ گورمانی جو اس زمانے میں شہزادہ کوٹھی میں رہتے تھے ان کے دست راست بن گئے دن رات ان کا بھی آنا جانا رہتا تھا۔ ان کے علاوہ خوشامدی لوگوں کا ایک پورا ٹولہ ان کے گرد جمع ہو گیا تھا۔ غلام محمد بیمار رہتے تھے۔ ویسے وہ بہت سخت آدمی تھے۔ ان کا بڑا رعب اور دبدبہ تھا۔ لوگ ان سے بہت ڈرتے تھے۔ کیونکہ وہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے۔ ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور ڈراؤنی تھیں اور لقوے کی وجہ سے انہیں اپنے دہانے کے اعضاء پر اختیار نہیں تھا اس لئے ان کے منہ کے ایک حصہ سے رال بہتی رہتی تھی وہ زیادہ بات چیت اردو یا انگریزی میں کرتے تھے۔ البتہ گالیاں پنجابی میں دیتے تھے۔

سیاستدانوں کو تنگ کرنے کے لئے غلام محمد نے پروڈا کا قانون نافذ کیا۔ ان دنوں سیاست میں سرفہرست خان عبدالقیوم خان تھے۔ غلام محمد نے اپنے سیکرٹری کے ایس اسلام کو حکم دیا کہ خان عبدالقیوم خان کے خلاف مقدمہ تیار کرو۔ چنانچہ سرحد کی حکومت سے سینکڑوں فائل منگوائے گئے اور اسلام صاحب نے میری مدد سے ان کے خلاف رپورٹ تیار کی۔ انعام کے طور پر اسلام صاحب کو دو ہزار روپے اور مجھے پانچ سو روپیہ گورنر جنرل صاحب نے دلوائے

کچھ عرصہ بعد اسلام صاحب کی جگہ ایک نئے سیکرٹری آئے جو کافی شوقین مزاج تھے۔ فرخ امین ان کے ماتحت ڈپٹی سیکریٹری تھے اور غلام محمد کے بہت منہ چڑھے تھے۔ نئے سیکریٹری فرخ امین کو بہت ڈانٹتے تھے۔ اس لئے انہوں نے ان کے خلاف غلام محمد کے کان بھرے غلام محمد جو کانوں کے کچے تھے۔ ان سے کہا کہ آپ کے سیکریٹری صاحب مس بورل سے معاشقہ لڑا رہے ہیں۔ غلام محمد فوراً تاؤ میں آگئے۔ اس وقت وہ ایبٹ آباد کے ٹور پر تھے۔ انہوں نے چوبیس گھنٹے کے اندر ایبٹ آباد چھوڑنے کا حکم صادر فرمایا۔ اور دوسری منسٹری میں ان کا فوری طور پر تبادلہ کرا دیا

ان کی بد اخلاقی کے بارے میں کچھ لوگوں کے بیانات میں تضاد پایا جاتا تھا۔ اس سلسلہ میں جو کچھ قدرت اللہ شہاب نے اپنی کتاب "شہاب نامہ" میں لکھا ہے اور جو ایم۔بی خالد نے اپنی کتاب "ایوان صدر میں سولہ سال میں" تحریر کیا ہے ان میں خاصا تضاد ہے۔

حسب ذیل اقتباسات سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔ شہاب صاحب "شہاب نامہ" کے صفحہ ۶۲۱ پر لکھتے ہیں۔ (جدید ایڈیشن ۸۸ء میں ۶۲۲)

"یہ بات سن کر مسٹر غلام محمد غصے میں آگئے۔ ان کا چہرہ سرخ ہو گیا اور انہوں نے کڑک کر کچھ دیر غوں غاں کی جس کا مفہوم مس بورل نے مجھے یوں سمجھایا۔"

"ہز ایکسی لینسی فرماتے ہیں۔ پنجاب گورنمنٹ جہنم میں جائے۔ جس بے ضابطگی کا ذکر آپ نے کیا ہے۔ وہ بھی آپ کے سمیت جہنم میں جائے۔"

ان کے منہ کے ایک کونے سے لعاب دہن کی پچکاری سی چلی اور کوٹ کی آستین

پر گر گئی۔ مس بورل نے بینکپن سے ان کا کوٹ صاف کیا اور مجھے مخاطب کر کے کہا۔ ہز ایکسی لنسی نے اپنی شدید خفگی کا اظہار کیا ہے کہ آپ حجت بہت کرتے ہیں۔ ایچ ای کا حکم ہے کہ آپ اس ناپسندیدہ عادت کو فوراً ترک کر دیں ورنہ آپ کو پچھتانا پڑے گا۔"

ایم بی خالد اپنی کتاب میں لکھتے ہیں۔

"ایک مخصوص طبقے نے ان کی درشت مزاجی کے کئی خود ساختہ افسانے پھیلا رکھے تھے اور مشہور کر رکھا تھا کہ وہ لوگوں کو پنجابی زبان میں ماں بہن کی گالیاں دیتے ہیں۔ حالانکہ میں نے چار سالوں کے دوران ان کے منہ سے کبھی کوئی غلیظ گالی نہیں سنی۔ اپنے ذاتی اور دیرینہ ملازم محمد دین اور قاسم خاں کو صرف بے وقوف یا الو کہہ دیا کرتے تھے۔ اسٹاف کے ساتھ لہجہ درشت ضرور تھا مگر الفاظ درست ہوتے تھے۔"

"غلام محمد کافی عرصے سے فالج کے مریض تھے۔ ان کا بلڈ پریشر مستقل طور پر بہت اونچا رہتا تھا۔ وہ چند قدم بھی بڑی مشکل سے چل پاتے تھے اور میں نے اکثر انہیں وہیل چیئر پر بیٹھ کر گورنر جنرل ہاؤس کا گشت کرتے دیکھا ہے۔ ان کے ہاتھوں میں رعشہ تھا اور وہ اپنے دستخطوں کے علاوہ کچھ لکھنے کے قابل نہیں تھے۔ ان کے دہن اور آس پاس کے عضلات لقوے سے متاثر تھے اور اس قدر کمزور ہو گئے تھے کہ جب وہ کھانے کی کوئی چیز منہ میں لے جاتے تھے تو اس کا کچھ حصہ دہانے کے دونوں جانب سے باہر گرتا رہتا تھا۔"

قدرت اللہ شہاب نے لکھا ہے کہ "اس زمانے میں جب غیر ملکی سفیر اپنی اسناد پیش کرنے آتا تھا تو اسے گورنر جنرل کے ساتھ دعوت دی جاتی تھی:

اسٹاف کے ممبر بھی اس میں شریک ہوتے تھے۔ وہ جس وقت لقمہ منہ میں ڈال کر نئے سفیر کے ساتھ گفتگو فرمانے کی کوشش کرتے تھے وہ سماں بڑا عبرتناک ہوتا تھا۔ ان کا مزاج پل میں تولہ، پل میں ماشہ ہوتا رہتا تھا۔ کبھی گرم، کبھی سرد، کبھی نرم کبھی سخت، لیکن میرا خیال ہے کہ ان کے مزاج کی گرمی اور سختی میں آمد کم ہوتی تھی اور

آور زیادہ۔ وہ دوسروں پر رعب گانٹھنے کے لئے یا محض تفنن طبع کے طور پر گیدڑ بھبکیوں سے کام لینا شروع کرتے تھے۔ آواز بلند کر کے اپنے اوپر بناوٹی غصہ طاری کرنا ان کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس عمل کے دوران رفتہ رفتہ بلڈ پریشر کا عفریت ان کو اپنی گرفت میں جکڑ لیتا تھا اور دراصل غصہ ان کے حواس پر قابو پا لیتا تھا۔ ان کے منہ سے جھاگ نکلنے لگتا تھا اور وہ چیخ چیخ کر نڈھال ہو جاتے تھے۔ اس نوعیت کے نظارے بڑے ناگفتہ بہ ہوتے تھے"۔ برخلاف اس کے ایم۔ بی خالد نے غلام محمد کو اس کے الزامات سے بری کرنے کے لئے تعصب سے کام لیا ہے۔ مثلاً وہ ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"سب سے زیادہ جن عوامل نے غلام محمد کی کردار کشی کو ہوا دی وہ میری نظر میں دو تھے۔ اول یہ کہ ان کی پیدائش پنجاب میں ہوئی اور انہیں اس جرم کی سزا بھگتنا پڑی۔ دوم ان کی تند مزاجی تھی۔ جس سے علاقائی تعصب کے مریضوں نے بھرپور فائدہ اٹھایا اور غلام محمد کے بارے میں خوب خوب قصے گھڑے اور پھیلائے۔ جھوٹ میں تھوڑا سچ ملا دیا جائے تو رنگ چوکھا آتا ہے چنانچہ جس شخص نے علی گڑھ میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد پوری زندگی لکھنؤ اور حیدر آباد دکن میں گزاری ہو اس کے متعلق کہا گیا کہ وہ ہر کس و ناکس کو موقع بے موقع پنجابی زبان میں ماں بہن کی غلیظ گالیوں سے نوازتا تھا۔"

ایک اور جگہ لکھتے ہیں۔

"صوبائی تعصب اور بالخصوص پنجاب کے خلاف بغض و عناد کی تاریخ پرانی ہے۔ مگر صاحبان اقتدار نے اس کا تدارک نہ کیا؟"

اگر خالد صاحب نے ساتھ میں یہ بھی لکھ دیا ہوتا کہ وہ کون کون لوگ تھے جنہوں نے اس بغض و عناد کی تاریخ میں اہم رول ادا کیا تو بات واضح ہو جاتی اور عوام کو

اس کا ثبوت ڈھونڈنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ ان کا بدکلامی کا ایک اور واقعہ یہ ہے کہ مولوی یوسف پیرزادہ جو ان دنوں ان کے پی۔ اے تھے (جنہیں وہ فنانس منسٹری سے اپنے ساتھ لے آئے تھے) انہوں نے ایک مرتبہ مجھے خود بتایا کہ جب وہ فنانس منسٹر تھے تو ایک روز انہوں نے پیر کے کسی جوائنٹ سیکرٹری کو بلوایا۔ شاید وہ غلط سمجھا۔ اور کسی دوسرے جوائنٹ سیکرٹری کو بلا لایا۔ جب وہ اندر آ گئے تو غلام محمد بہت سخت برہم ہوئے اور کہنے لگے۔

"مجھے معلوم ہے تم بے وقوف ہو۔ مگر میں نے دوسرے بیوقوف کو بلایا تھا۔ اسے بھیجو۔"

میں ابھی بیان کر چکا ہوں کہ ان کے اطراف خوشامدی لوگ جمع ہونے شروع ہو گئے تھے۔ مگر خالد صاحب ان کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"غلام محمد کو خوشامدیوں سے سخت نفرت تھی۔ وہ زمانہ قبل از مسیح کا فرمانروا ہوتا تو جیسی اس کی خصلت تھی جناب پیر صاحب کو فی الفور دریائے سندھ کے کسی بھوکے مگر مچھ کے حوالے کر دیتا۔"

شہاب نامے میں شہاب صاحب نے ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک مرتبہ کراچی کے چند مشہور و معروف شہریوں کی درخواست موصول ہوئی کہ انہیں شہر کا ایک وفد گورنر جنرل ہاؤس میں ایک تقریب منعقد کر کے غلام محمد کی خدمت میں "محافظ قوم" کا خطاب پیش کرنا چاہتا ہے۔ میں نے مشورۃً نوٹ کیا کہ یہ صرف خوشامدی لوگ ہیں۔ ان کی درخواست رد کر دی جائے۔

میرا نوٹ پڑھ کر غلام محمد نے پھاڑ کر پھینک دیا اور میرے پیچھے پڑ گئے کہ پوری قوم تو میری قدر شناسی کر رہی ہے اور میں اس منصوبے کو سبوتاژ کر رہا ہوں چنانچہ اس

عرضی کا جواب انہوں نے ڈپٹی سیکرٹری سے دلوایا اور لکھوایا کہ وہ یہ اعزاز قبول کرنے کو تیار ہیں۔ اس مقصد کے لئے جو تقریب منعقد ہوئی وہ اس نوعیت کی تھی جیسے بچے جھوٹ موٹ گڈے گڑیا کی شادی رچاتے ہیں۔

کراچی کے پچیس تیس جتادری خوشامدی فرش پر ادب سے بیٹھ گئے۔ غلام محمد کالی شیروانی اور جناح کیپ پہنے کرسی پر بیٹھے تھے۔ ایک صاحب نے سنہری چوکھٹے میں فریم کیا ہوا ڈیڑھ فٹ لمبا تعریفی ایڈریس پڑھا۔ اور تمام تر صنائع کو کام میں لاکر مسٹر غلام محمد کو قوم کا نجات دہندہ کہا۔ اور انہوں نے اعلان کیا کہ وہ آخری سانس تک قوم کی خدمت کرتے رہیں گے۔ پھر نجات دہندہ قوم زندہ باد کے نعرے لگے اور بعد میں سب نے چائے کے ساتھ کیک، پیسٹریاں اور سموسے کھائے۔

جھوٹ، چاپلوسی اور خوشامد کی اس سے بڑی مثال اور کیا ہو سکتی ہے۔

یہی نہیں جگہ جگہ خالد صاحب نے ایک خاص انداز سے غلام محمد کی تعریف کی ہے اور ساتھ ساتھ دوسرے سربراہان کی برائی بھی کر دی ہے تاکہ اس تضاد سے ان کی خوبیاں ابھر کر سامنے آجائیں۔ مثلاً وہ لکھتے ہیں۔

وہ اپنے دوستوں کو اکثر تحائف بھیجتے اور پارسلوں پر ذاتی حساب سے ٹکٹ لگائے جاتے۔ سرکاری مصارف اور نجی مصارف کے فرق کو ملحوظ رکھنے کی سختی سے ہدایت تھی۔ اس قسم کی احتیاط نہ اسکندر مرزا میں دیکھی اور نہ فیلڈ مارشل میں۔ خواجہ ناظم الدین بھی ان باتوں سے بے پرواہ تھے۔

خواجہ ناظم الدین کے بارے میں جو واقعہ میں نے بیان کیا ہے اور جو خود میرے ساتھ پیش آیا وہ ایم۔ بی خالد صاحب کے اس بیان کی نفی کرتا ہے۔ خواجہ صاحب اپنے ذاتی اخراجات

اپنی جیب سے کرتے تھے۔ اور اسی سے ان کی خودداری کا اندازہ ہوتا ہے
خواجہ صاحب کی کردار کشی انہوں نے خوب کی ہے۔

ایک جگہ لکھتے ہیں۔

"خواجہ صاحب ۱۹۴۸ء میں گورنر جنرل بنے تو اپنی تن آسانی کے سبب مرغوں اور کتے اور ریچھوں کی لڑائی جیسے لہو و لعب میں مشغول رہے۔ اپنی بسیار خوری کے باعث گورنر جنرل، لوگوں میں خواجہ ناظم الدین کی بجائے خواجہ ہاضم الدین کہلائے۔"

اور ایک بات تو خالد صاحب نے ایسی لکھی ہے جس کے لئے ثبوت یا گواہ کا نام پیش کرنا لازمی تھا... لکھتے ہیں۔

"ناظم الدین دولت مشترکہ کانفرنس میں شرکت کے لئے لندن گئے تو ملکہ برطانیہ سے پرزور اپیل کی کہ غلام محمد کو گورنر جنرل کے عہدے سے سبکدوش کر دیا جائے" سوال پیدا ہوتا ہے کہ انہوں نے کس وقت یہ اپیل کی تھی اور اس کا کیا ثبوت موجود ہے؟ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بعض جگہ انہوں نے اپنی کتاب میں ایسی زبان استعمال کی ہے جو ایک سنجیدہ مزاج انسان کو استعمال نہیں کرنی چاہیئے۔ مثلاً اسکندر مرزا کے بارے میں لکھتے ہیں۔

"اسلامی جمہوریہ پاکستان کے پہلے صدر میجر جنرل اسکندر مرزا نے اپنی صدارت کے تین برسوں میں، پانچ وزراء اعظم خرچ کر ڈالے۔ اپنی صدارت کی اس قلیل مدت میں اسکندر مرزا نے سیاست اور سیاست والوں کی مٹی پلید کر دی۔"

یا مثلاً بھٹو صاحب کے بارے میں ایک جگہ لکھا ہے۔

"ذوالفقار علی بھٹو میں ابھی سیاسی پختگی نہیں آئی تھی برس پندرہ یا کہ سولہ کا سن تھا۔"

ایم بی خالد صاحب نے غلام محمد کے بارے میں جو بات سب سے دلچسپ لکھی ہے وہ یہ ہے "غلام محمد ایسا میر کارواں تھا جو نگاہ بلند اور جاں پرسوز کی دولت سے مالا مال تھا۔"
خالد صاحب نے شاید اپنی دانست میں غلام محمد کے بارے میں یہ جملہ تعریفی طور پر لکھا ہے۔

غلام محمد صاحب کی سب سے بڑی کمزوری حسن تھا۔ حسین صورت انہیں میلوں دور سے نظر آجاتی تھی!

میرے خیال میں اس کی بہترین مثال مس بورل تھی۔ (جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں)
مس بورل کا پورا نام مس روتھ بورل تھا۔ وہ غلام محمد کی پرسنل سیکرٹری تھی۔ "یہ بڑی طرحدار، نازک اندام، خوبصورت، نیم امریکن، نیم سوئس لڑکی تھی"۔ غلام محمد ایک مرتبہ ٹور پر امریکہ گئے تھے انہوں نے مس بورل کو پہلی مرتبہ وہیں اپنے سفارت خانے میں دیکھا وہ اس وقت وہاں شاید سفیر کی سیکرٹری تھی۔ غلام محمد نے وہیں اس کا انٹرویو کیا اور کہا کہ وہ اسے اپنی پرسنل سیکرٹری بنانا چاہتے ہیں۔ بعد میں سفارت خانے کی معرفت اسے کراچی بلوا لیا۔ وہ اپنی ماں کو بھی ساتھ لے کر آئی۔ ان کی رہائش کے لئے گورنر جنرل ہاؤس میں ایک مکان دے دیا گیا تھا۔ غلام محمد اکثر خود اس کے دفتر کے کمرے میں آجاتے تھے بعض دفعہ وہ اسے اوپر اپنے پاس بلا لیتے تھے۔ اس سلسلے میں ایک دلچسپ واقعہ مجھے خود ان کے جمعدار شادی خان نے سنایا جسے وہ اپنے ساتھ فنانس منسٹری سے لائے تھے۔

"ایک روز غلام محمد جب اپنے کمرے سے باہر نکلے تو میں نے دیکھا کہ ان کے ہونٹوں پر سرخی لگی ہوئی تھی میں نے ہمت کر کے ان سے کہا "سر آپ کے ہونٹوں پر کچھ لگا ہوا ہے"۔ انہوں نے پوچھا کیا لگا ہے۔ میں نے کہا "کچھ لال لال لگا ہے۔ آپ ٹائلٹ میں جا کر دیکھ لیجئے۔ دراصل وہ لپ اسٹک کے نشان تھے۔ بہرحال وہ ٹائلٹ میں چلے گئے اور ہونٹ صاف کر کے باہر آئے اور مجھ سے کہا "تم بہت اچھے آدمی ہو کہ مجھے بتا دیا ابھی میرے پاس پرائم منسٹر اور دیگر لوگ آئیں گے۔" پھر انہوں نے مجھے اسی وقت ۱۰۰ روپیہ انعام دیا۔"

اس سلسلے میں شہاب نامے کا حسب ذیل اقتباس بھی قارئین کی
دلچسپی کا باعث ہوگا۔

"ایک روز دفتر پہنچتے ہی پیغام ملا کہ گورنر جنرل یاد فرما رہے ہیں
میں ان کے بیڈروم میں داخل ہوا تو فرش پر ایک فائل پڑی ہوئی نظر
آئی۔ میں نے سوچا کسی بے خیالی میں گر گئی ہوگی۔ میں اسے اٹھانے کے
جھکا ہی تھا کہ گورنر جنرل نے اپنا ٹائم پیس تڑاخ سے میرے سر پر دے مارا
اور گرج کر کہا۔ "فائل کو ہاتھ نہ لگاؤ۔ ٹائم پیس اٹھا کر یہاں لاؤ" میں نے
ٹائم پیس اٹھا کر انہیں واپس دیا تو انہوں نے ٹٹول کر اس کا بغور جائزہ
لیا کہ میرے سر سے ٹکرا کر اس کا کچھ بگڑ تو نہیں گیا۔
میرے سر میں اس کی ضرب سے گومڑ
سا پڑ گیا تھا۔ میں نے کسی قدر طنز سے کہا۔

"یہ ٹائم پیس بڑا نازک اور قیمتی ہے۔ اس سے پتھر کا کام لینا
جائز نہیں۔"

"تمہارا سر بھی تو کنکریٹ سے بنا ہوا ہے۔"
مسٹر غلام محمد نے مسکرا کر کہا...

خیر سگالی کی اس گفتگو کے بعد انہوں نے مجھے مسہری پر بیٹھا لیا اور فرش پر پڑی
ہوئی فائل کا قصہ سنایا۔ بات یہ ہوئی کہ کل رات انہوں نے مس بورل کو ڈنر پر مدعو کیا
تھا۔ وہ حسب معمول اپنی بوڑھی والدہ کو بھی اپنے ساتھ لے آئی۔ یہ بات غلام محمد کو پسند نہ تھی۔
ان کی خواہش تھی کہ مس بورل ڈنر پر تنہا آیا کرے۔ لیکن مس بورل اکثر ان کی اس آرزو
کو پورا نہ کرتی تھی۔ گذشتہ رات ڈنر کے دوران مسٹر غلام محمد نے مس بورل کی والدہ کے
ساتھ بڑی بے رخی کا برتاؤ کیا اور کچھ نازیبا کلمات بھی کہے۔ مس بورل نے اس بات کا

بہت برا منایا۔ آج صبح گورنر جنرل نے اسے ایک فائل کے ساتھ اپنے کمرے میں طلب کیا۔
وہ منہ پھلائے ہوئے آئی۔ مسٹر غلام محمد نے اسے حکم دیا کہ وہ صبح سویرے رونی صورت
لے کر ان کے کمرے میں نہ آئے۔ بلکہ مسکراتی ہوئی ان سے ملے۔

مس بورل اسی طرح منہ پھلائے کھڑی رہی۔ گورنر جنرل نے تحکمانہ
انداز میں کئی بار اسے مسکرانے کا حکم دیا تو اس نے غصہ میں فائل زمین پر
دے ماری اور روتی ہوئی کمرے سے نکل گئی۔

اب غلام محمد نے میرے ذمہ یہ ڈیوٹی سپرد کی کہ میں مس بورل کو
سمجھا بجھا کر یہاں واپس لاؤں۔ وہ مسکراتی ہوئی کمرے میں داخل ہو اور
ہنسی خوشی فرش پر پڑی فائل اٹھا کر گورنر جنرل کے حضور پیش کرے۔

میں مس بورل کے پاس گیا تو غالباً وہ اس نوعیت کی طلبی کے انتظار
میں بیٹھی تھی۔

وہ بڑی زیرک اور غم گسار لڑکی تھی اور اسے مسٹر غلام محمد کی معذوریوں کی وجہ سے ان کے
ساتھ ایک خاص قسم کی ہمدردی تھی میں نے اسے ٹائم پیس سمیت سارا واقعہ سنایا تو وہ
فوراً میرے ساتھ چلنے پر آمادہ ہو گئی۔ گورنر جنرل کے کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے اپنی مسکراہٹوں
کا فوارہ چھوڑا اور فرش پر پڑی ہوئی فائل اٹھا کر اسے بصد ادب و احترام ان کی خدمت
میں پیش کیا۔ مسٹر غلام محمد کا چہرہ دودھ پیتے بچے کی طرح کھل اٹھا اور ان کے منہ کے دونوں
کونوں سے بے اختیار رالیں ٹپکنے لگیں۔ پھر اچانک ان کی نظر مجھ پر پڑی، ان کی پیشانی پر
بل پڑ گئے اور غرا کر بولے۔

"تم یہاں کیا کر رہے ہو۔۔۔ تمہیں یہاں کس نے بلایا ہے۔ میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔"

ایک مرتبہ میری ان سے ذاتی ملاقات اس طرح ہوئی کہ ان کے پی اے مولوی یوسف
چھٹی پر تھے۔ مولوی یوسف نہایت نیک انسان تھے۔ وہ داڑھی رکھتے تھے اور روزہ نماز

کے پابند تھے وہ لوگوں کے ساتھ غلام محمد کے طرز عمل سے سخت دل گرفتہ رہتے تھے۔ اس دن غلام محمد کو کچھ لکھوانے کی ضرورت پیش آئی ان کے جمعدار شادی خان میرے پاس آیا اور کہنے لگا۔

"مولوی صاحب آج چھٹی پر ہیں لاڈ صاحب نے آپ کو بلایا ہے"

(غلام محمد اپنے آپ کو اسٹاف سے لاڈ صاحب ہی کہلواتے تھے) میں ان کے کمرے میں چلا گیا میں نے جا کر انہیں سلام کیا۔ انہوں نے میرا نام پوچھا۔ میں نے بتایا کہ میرا نام فخر عالم زبیری ہے تو کہنے لگے کہ اچھا آپ زبیری خاندان کے ہیں۔ آپ کی عظمت الٰہی زبیری سے کیا رشتہ داری ہے۔

میں نے بتایا کہ وہ میری بیگم کے پھوپھا ہیں (عظمت الٰہی زبیری ایک عرصے تک علی گڑھ یونیورسٹی کے رجسٹرار رہے ہیں) انہوں نے پوچھا کہ کیا وہ پاکستان نہیں آئے۔۔۔ وہ اس وقت تک نہیں آئے تھے۔ (بعد میں وہ یونیورسٹی سے ریٹائر ہو کر پاکستان آ گئے تھے اور ان کا انتقال کراچی میں ہوا) اس تعارف کے بعد انہوں نے دو خط لکھوائے جن کا آدھے سے زیادہ حصہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ مگر میں ان سے یہ کیسے کہتا کہ میری سمجھ میں نہیں آیا۔ فالج کی وجہ سے وہ کچھ اس طرح بولتے تھے کہ انہیں سمجھنا بڑا مشکل تھا۔ اس دوران میں انہوں نے شادی خان کو حکم دیا کہ کرنل نواز کو بلا لاؤ۔۔۔ جب وہ آ گئے تو میری موجودگی میں ہی انہیں برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔ میں نے محسوس کیا کہ کرنل صاحب کو میری موجودگی میں بہت شرمندگی ہو رہی ہے۔ اس لئے میں اٹھ کر باہر چلا گیا۔ پانچ منٹ بعد کرنل نواز باہر آ گئے۔ ان کا منہ اترا ہوا تھا۔ کرنل نواز غلام محمد کے ملٹری سیکرٹری تھے مگر وہ ان سے ہر قسم کا کام لیتے تھے۔ ٹور کے معاملات طے کرنا اسپیشل ٹرین کا انتظام کرنا اور اسی قسم کے دیگر کام شاید اسی قسم کے کسی کام کے سلسلے میں ان پر گالیاں پڑ رہی تھیں۔ بہر حال ان کے جانے کے بعد میں دوبارہ کمرے میں گیا اور پوچھا "کوئی اور کام؟" انہوں نے کہا "نہیں۔ بس یہی خط

ٹائپ کر کے میرے پاس بھیج دو۔"

میں سخت پریشان تھا اور میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ جو حصے میں نہیں سمجھ سکا ہوں وہ کیسے پورے کروں۔ آخر مجبور ہو کر میں نے ان کے سیکریٹری انور علی سے مشورہ کیا۔ انور علی نے اپنی سمجھ سے وہ حصے پورے کرا دیئے۔

میری خوش قسمتی کہ دوسرے روز وہ دونوں خط دستخط ہو کر واپس آگئے اور میں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

غلام محمد کے پاس ایک چھوٹا بکس تھا جسے وہ کسی کو چھونے نہیں دیتے تھے۔ وہ اس میں ضروری کاغذات وغیرہ رکھا کرتے تھے۔ اور اسے خود ہی کھولتے اور بند کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے چپراسی سے کہا کہ اس کا ڈھکنا پکڑے رہنا۔ وہ چپراسی نیا تھا اور بہت گھبرایا ہوا تھا۔ وہ ڈھکنا اتفاقاً اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ انہوں نے اسے بہت ڈانٹ اور گالیاں دیں۔ اور مجھے بلا کر کہا کہ یہ چپراسی بہت بدتمیز اور نااہل ہے اسے فوراً نوکری سے نکال دو۔ میں اسے ملٹری سیکریٹری کے پاس لے گیا اور ان سے کہا کہ لاٹ صاحب نے کہا ہے کہ اسے فوراً نوکری سے نکال دو۔ اس بیچارے کے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ یہ کہاں جائے گا۔ ملٹری سیکریٹری نے اسے نوکری سے تو نہیں نکالا البتہ اسے دفتر میں ڈسپیچ میں لگا دیا اور کہا کہ کبھی لاٹ صاحب کے سامنے مت آنا ورنہ میری نوکری بھی خطرے میں پڑ جائے گی۔ ان کے گھریلو حالات کے سلسلے میں ایم بی خالد نے ایک اچھا جملہ لکھا ہے "قدرت کی ستم ظریفی دیکھئے کہ بیوی کا نام بادشاہ بیگم تھا مگر بادشاہ اور بیگم کے درمیان ایک مدت سے تعلقات کشیدہ تھے۔" البتہ انہیں اپنی بیٹی سے جن کی شادی حسین ملک سے ہوئی تھی بہت پیار تھا وہ اکثر ان کے پاس آتی رہتی تھیں۔ یہ خود بھی ان کے گھر جایا کرتے تھے ان کے بیٹے انعام محمد تھے بگر بیٹی کے مقابلے میں ان کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ بلکہ وہ اکثر ان سے زیادہ

ناراض رہتے تھے۔ ایک روز تو ان پر بہت ہی غصہ کیا۔ ان کی ٹائی پکڑ کر کھینچی اور کمرے سے باہر نکال دیا اور کہا کہ "آئندہ تم کبھی گورنر جنرل ہاؤس مت آنا۔"

مگر سنا ہے کہ بعد میں اسے معاف کر دیا تھا جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے غلام محمد پر فالج کا بہت اثر تھا ان کی زبان اور ہاتھ صحیح کام نہیں کرتے تھے۔ ایک فوجی خادم حسین فزیو تھراپسٹ کا تبادلہ کر کے گورنر جنرل ہاؤس بلوایا گیا تھا۔ وہ روزانہ ان کی مالش کیا کرتا تھا اس سے انہیں تھوڑا بہت افاقہ ہو گیا تھا۔ غلام محمد نے اب اپنی کھوئی ہوئی جسمانی قوتوں کو بحال کرنے کی ٹھان لی اس کے لئے انہوں نے ایک حکیم صاحب کو خاص طور پر لکھنؤ سے بلوایا تھا جو نابینا تھے اور ان کی عمر تقریباً ایک سو پانچ برس سے زیادہ تھی۔ ان کے ساتھ ان کا ایک بیٹا بھی آیا تھا جس کی عمر تقریباً دس بارہ برس تھی۔ یہ لڑکا حکیم صاحب کے بیانوے برس میں پیدا ہوا تھا۔ اس لئے اس لڑکے کو ان کی طبابت کا جیتا جاگتا سرٹیفکیٹ تسلیم کیا جاتا تھا۔

حکیم صاحب نے ان کے علاج کے لئے مختلف جڑی بوٹیاں منگوائیں اور گورنر ہاؤس کے ایک حصے میں جو اب حکیم صاحب کا چھوٹا سا مطب بن گیا تھا۔ دوائیں تیار کی جانے لگیں۔ کئی مرتبہ انہوں نے سو ڈیڑھ سو چڑے منگوائے۔ ان کو ذبح کر کے ان کا مغز کسی دوا میں استعمال کیا جاتا تھا اور ان کے گوشت کی یخنی حکیم صاحب خود پیتے تھے۔

ان مغزیات اور لحمیات وغیرہ سے مقوی ادویات اور کشتے تیار کئے جاتے تھے اور وہ بڑے اہتمام سے غلام محمد کو کھلائے جاتے تھے اس کا نتیجہ ظاہر تھا ان کا بلڈ پریشر بہت بڑھ گیا اور وہ ایک روز بے ہوش ہو کر کوما میں چلے گئے۔ پھر انہیں آکسیجن لگائی گئی۔ اس کے بعد حکیم صاحب کو واپس بھجوا دیا گیا غلام محمد پیری مریدی کے بہت قائل تھے انہیں حاجی وارث شاہ سے بہت عقیدت تھی۔ یہ بزرگ لکھنؤ کے قریب دیوا شریف میں دفن ہیں ان

کا انتقال غالباً بیسویں صدی کے اوائل میں ہوا تھا۔ غلام محمد نے وارث شاہ کی کچھ نگارشات اور سوانح حیات شائع کرنے میں کافی مدد کی تھی۔ اور تقسیم سے پہلے کئی دفعہ دیوا شریف جا چکے تھے۔

اپنی وفات سے کچھ دن پہلے انہیں دیوا شریف جانے کا خیال پیدا ہوا وہ ایک ہوائی جہاز چارٹر کر کے وہاں جانا چاہتے تھے۔ بلکہ آخری دن تک انہیں وہاں جانے کا خیال رہا۔ لیکن ان کی صحت اتنی خراب ہو چکی تھی کہ ان کی یہ آرزو پوری نہ ہو سکی۔

انہیں حاجی وارث شاہ سے اتنی گہری عقیدت تھی کہ وہ ان کا فوٹو ہمیشہ اپنے بستر کے قریب ایک تپائی پر رکھا کرتے تھے۔

غلام محمد اکثر بعض وزراء اور سیکرٹریوں کو بغیر وزیر اعظم کی اطلاع کے اپنے پاس بلایا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ سیکرٹری جنرل چودھری محمد علی کا آنا جانا رہتا تھا جو وزیر اعظم کو بغیر مطلع کئے بہت سے معاملات غلام محمد کے ساتھ طے کر لیتے تھے۔ ایک روز انہوں نے وزیر اعظم کو مشورہ دیا کہ وہ وزیر خوراک عبدالستار پیرزادہ اور وزیر صنعت فضل الرحمٰن کو وزارتوں سے فوراً علیحدہ کر دیں کیونکہ دونوں کی غلط پالیسیوں کی وجہ سے ملکی معیشت خراب ہو گئی ہے۔

خواجہ صاحب کو یہ بات اچھی نہیں لگی اور انہوں نے غلام محمد کے کہنے پر عمل نہیں کیا خواجہ صاحب کے مخالفین جو غلام محمد کے حواریوں میں تھے۔ برابر ان کے خلاف کام کر رہے تھے۔ غلام محمد کو مشورہ دیا جا رہا تھا کہ وہ موجودہ کیبنٹ کو تبدیل کر دیں۔ مگر خواجہ صاحب ان کے مشورے پر عمل نہیں کر رہے تھے۔ چنانچہ غلام محمد نے انہیں وزارت عظمیٰ سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا جس روز انہیں برخواست کیا گیا وہ جمعہ کا دن تھا۔ خواجہ صاحب کا پروگرام نماز جمعہ کے بعد حیدر آباد جانے کا تھا۔ غلام محمد کے ملٹری سیکرٹری کرنل حامد نواز نے ٹیلیفون

پر خواجہ صاحب سے کہا کہ گورنر جنرل صاحب نے آپ کو یاد فرمایا ہے
خواجہ صاحب نے معذرت پیش کی کہ جمعہ کی نماز کا وقت قریب ہے۔
حیدرآباد سے واپسی پر حاضر ہوں گا۔
مگر کرنل صاحب نے اصرار کیا کہ چند منٹ کے لئے ہی آ جائیے کوئی اہم
کام ہے۔

غرض خواجہ صاحب آ گئے اس وقت بھی وہ اپنے لباس میں تھے جو وہ عموماً
پہنا کرتے تھے۔ ٹخنوں سے اوپر شرعی پاجامہ، شارک اسکن کی شیروانی، ایک ہاتھ میں چھڑی
اور دوسرے ہاتھ میں ٹوپی۔ غلام محمد بھی جمعہ کے روز شیروانی پہنتے تھے (جمعہ کا اتنا احترام ضرور
کرتے تھے۔ اس روز وہ گرے شیروانی اور گرے جناح کیپ لگائے ہوئے تھے۔

خواجہ صاحب کے اندر داخل ہوتے ہی انہوں نے خواجہ صاحب سے استعفیٰ مانگا۔
خواجہ صاحب نے کہا کہ اسمبلی میں میری واضح اکثریت ہے۔ آپ مجھ سے استعفیٰ کیوں مانگ
رہے ہیں۔ غلام محمد ایک دم اپنے اصلی رنگ میں آ گئے۔ ان کا پارہ چڑھ گیا اور انہوں نے گرج
کر کہا۔ "میں تمہیں برخواست کرتا ہوں۔"

یہ کہہ کر وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ خواجہ صاحب پریشانی کے عالم میں کمرے سے نکلے۔
گھبراہٹ میں اپنی ٹوپی بھی غلام محمد کی میز پر بھول گئے۔ پورچ میں جب وہ اپنی گاڑی تک
پہنچے تو ان کا جھنڈا اترا ہوا تھا۔ موٹر سائیکل سوار پہلے ہی غائب ہو چکے تھے۔ خواجہ صاحب
کے ڈرائیور نے کار کا دروازہ کھولا وہ کار میں بیٹھ کر روانہ ہو گئے۔ تھوڑی دیر بعد جب
غلام محمد اپنے کمرے سے باہر آئے تو ان کی ٹانگ پر فالج کا اثر کم لگ رہا تھا اور ان کے
چہرے پر ایک عجیب فاتحانہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ اسی وقت اسکندر مرزا بھی ان کے
پاس آ گئے۔ اسی رات ۸ بجے جنرل محمد ایوب خان، لیفٹیننٹ جنرل برکی اور لیفٹیننٹ جنرل
اعظم خان پہنچے۔ سب نے ایک دوسرے سے فاتحانہ طریقے پر ہاتھ ملائے۔ نئے وزیر اعظم

کا انتخاب ہو چکا تھا۔ یعنی محمد علی بوگرہ۔ انہیں مشورے کے لئے امریکہ سے پہلے ہی خاموشی سے بلایا جا چکا تھا۔

خواجہ صاحب کی بدقسمتی یہ تھی کہ اس وقت کے کراچی پولیس کے سربراہ کاظم رضا نے ایک خفیہ انٹیلی جنس رپورٹ تیار کر کے وزیراعظم کو بھیج دی تھی جس میں انہیں مطلع کر دیا گیا تھا کہ ان کی حکومت کا تختہ الٹا جانے والا ہے۔ مگر خواجہ صاحب کو اس رپورٹ کے پڑھنے کا وقت ہی نہ ملا۔

جب خواجہ صاحب کو معلوم ہوا کہ محمد علی بوگرہ امریکہ سے آئے ہوئے ہیں تو ان کو طلب کیا کہ وہ اس وقت امریکہ سے کیوں اور کس کام سے آئے ہیں۔ اس وقت بوگرہ پریشان ہو گئے اور وہ سمجھے کہ شاید خواجہ صاحب کو تمام خفیہ پلان کا پتہ چل چکا ہے۔ مگر حقیقت اس کے برعکس تھی۔

قریب تھا کہ محمد علی بوگرہ سب کچھ اگل دیتے مگر خواجہ صاحب خود ہی بولتے رہے کہ اس وقت ان کا پاکستان آنا امریکہ کے لئے ناخوشگواری کے اثرات پیدا نہ کر دے کیونکہ ان دنوں پال ہافمین (فورڈ فاؤنڈیشن کے سربراہ) ابھی پاکستان آئے ہوئے تھے اور اس بات کا خدشہ تھا کہ بوگرہ کی آمد کو اس کی آمد سے متعلق نہ سمجھا جائے کیونکہ انہی دنوں امریکہ نے شہنشاہ ایران کے خلاف مصدق کی بغاوت کو کچلنے میں نمایاں کردار ادا کیا تھا۔ جب بوگرہ نے خواجہ صاحب کی یہ گفتگو سنی تو ان کو بڑا اطمینان ہوا اور انہوں نے سکون کا سانس لیکر کہا کہ وزیراعظم کا خیال صحیح ہے۔ دراصل خواجہ صاحب کو علیحدہ کرنے کے تمام انتظامات ایک ہفتے قبل ہی طے کر لئے گئے تھے اور ۱۷ اپریل کی تاریخ بھی مقرر کر لی گئی تھی اسکندر مرزا نے جو بلان میں برابر کے شریک تھے کراچی میں کسی بھی صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لئے فوج کے دستے متعین کر دیئے تھے۔ اس طرح یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے اس تمام کارروائی کے پیچھے صرف غلام محمد نہیں تھے۔ جیسا کہ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے

بلکہ اس تمام کارروائی کے پیچھے مقصد یہ تھا کہ خواجہ صاحب آئین ساز اسمبلی میں اپنا مسودہ آئین نہ پیش کر سکیں۔

مجھ سے کئی لوگوں نے یہ سوال کیا ہے کہ جب غلام محمد اس قدر معذور اور بیمار شخص تھے پھر کس طرح انہوں نے اس قسم کے اقدامات کئے جس سے پورے ملک کی سیاست کا رخ ہی بدل گیا۔ اس کا جواب دینے کے لئے ایوب خان کی کتاب "جس رزق سے آتی ہو پرواز میں کوتاہی" کا حسب ذیل اقتباس (جسکا تعلق محمد علی بوگرہ سے ہے) غلام محمد کے سوچنے کا انداز اور طریقہ کار پوری طرح واضح ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں۔

"لندن ائرپورٹ پر گورنر جنرل نے مجھے ٹیلی فون پر بلوایا لیکن ان کی بات بالکل میری سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے ٹیلی فون اسکندر مرزا کو دیدیا۔ ہمیں بس اس قدر معلوم ہو سکا کہ گورنر جنرل مجھے فوراً پاکستان بلانا چاہتے ہیں۔ (اس وقت ایوب خاں وزیر اعظم محمد علی بوگرہ، چوہدری محمد علی اور اسکندر مرزا کے ساتھ لندن گئے ہوئے تھے) اسکندر مرزا چودھری محمد علی اور میں، ہم تینوں واپس پاکستان آگئے اور گورنر جنرل کی کوٹھی پر پہنچے۔۔۔ گورنر جنرل اوپر کی منزل پر اپنی خوابگاہ میں لیٹے ہوئے تھے ان کے خون کا دباؤ بڑھ گیا تھا اور پیٹھ میں بڑی سخت تکلیف تھی جس کی وجہ سے وہ سیدھے ایک "تختے" پر چار و ناچار چت لیٹنے پر مجبور تھے۔

وہ غصے میں آگ بگولا ہو رہے تھے۔ اور گالیوں کی بوچھاڑ تھی کہ تھمنے کا نام نہ لیتی تھی لیکن خوش قسمتی سے یہ گالیاں کسی کی سمجھ میں نہ آتی تھیں۔ اس کے بعد اسکندر مرزا کچھ بولے ان پر بھی بوچھاڑ پڑی۔ ہم ان کی خدمت میں یہ گذارش کرنا چاہتے تھے کہ آپ بوگرہ کو ایک موقع اور دیں۔ جواب میں انہوں نے غرا کر کہا "جاؤ۔۔۔ جاؤ۔۔۔ دور ہو جاؤ۔"

ان کی زبان سے بار بار "نہیں نہیں" کے الفاظ نکلتے تھے۔ وہ بس ہم کو بھگا دینا چاہتے تھے ہم ایک کے پیچھے ایک ان کی خوابگاہ سے نکلے آگے آگے اسکندر مرزا، ان کے پیچھے چودھری محمد علی

پیہ سب سے پیچھے ہیں"، میں کمرے سے باہر قدم رکھنے ہی کو تھا کہ اس نرس نے جو ان کی خدمت پر مامور تھی، میرا کوٹ پکڑ کر کھینچا۔ میں پلٹا . . . دیکھتا ہوں کہ میں ایک بالکل مختلف آدمی سے دوچار ہوں۔

یہی ہمارے بیمار بوڑھے گورنر جنرل جو لمحہ بھر پہلے غصہ سے دیوانے ہو رہے تھے اب ان کا چہرہ مسرت سے کھل اٹھا تھا اور قہقہے لگا رہے تھے۔ میں نے دل میں کہا

"آپ بھی بڑے حضرت ہیں"

انہوں نے ایک خاص مسرت کی چمک آنکھوں میں لئے مجھے اشارہ کیا۔

"مسہری پر بیٹھ جاؤ۔"

اس کے بعد انہوں نے تکیے کے نیچے سے دو دستاویزیں نکالیں۔ ان میں سے ایک پر کچھ اس قسم کی عبارت درج تھی کہ "میں غلام محمد فلاں فلاں وجوہ کی بنا پر فلاں اختیارات جنرل ایوب خاں کو سونپتا ہوں، اور حکم دیتا ہوں کہ وہ تین مہینے کے اندر اندر آئین تیار کریں۔

میں نے اس کاغذ پر نظر ڈالی اور دل میں کہا "خدا آپ سے سمجھے . . . پچھلے آٹھ برس تو آپ کو ہوش نہ آیا اور اب آپ چاہتے ہیں کہ میں تین مہینے میں دستور بنا کے پیش کر دوں"۔

دوسری دستاویز اس مضمون کی تھی کہ میں نے اس پیشکش کو منظور کر لیا ہے۔ جیسے ہی میں نے ان کاغذات پر نظر ڈالی میرا تن بدن پکار اٹھا "نہیں ہرگز نہیں"۔

میں نے کہا۔ "آپ جلد بازی سے کام لے رہے ہیں . . . آپ اپنی موجودہ ذہنی کیفیت میں کوئی بات کر گزرنا چاہتے ہیں جس کا نتیجہ آگے چل کر سوائے ملک کے نقصان کے اور کچھ نہیں ہوگا"

اس کے جواب میں انھوں نے مجھ پر گالیوں کی ایک بوچھاڑ کر دی۔"

جب غلام محمد کی ذہنی کیفیت کافی خراب ہو گئی تو اسکندر مرزا چودھری محمد علی اور جنرل ایوب خاں نے مل کر یہ فیصلہ کیا کہ اب انہیں گورنر جنرل کے عہدے سے دست بردار کر دیا جائے

وہ آسانی سے کرسی چھوڑنے والے نہ تھے۔ پہلے انھیں دو ماہ کی رخصت دلائی گئی اور اسکندر مرزا کو ایکٹنگ گورنر جنرل بنا دیا گیا۔ ان دنوں اسکندر مرزا گورنر جنرل ہاؤس کے پچھلے گیٹ سے داخل ہوتے۔ ان کا اے ڈی سی انھیں کمرے میں بٹھا کر سب افسران کو ان کے آنے کی اطلاع دے دیتا اور فائلیں اسکندر مرزا کو بھیج دی جاتیں۔ دو پہر کو اسکندر مرزا اسی طرح خاموشی سے پچھلے دروازے سے واپس چلے جاتے۔

کچھ دنوں بعد جب غلام محمد کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تو وہ وہیل چیئر پر بیٹھ کر کمرے سے باہر نکلنا شروع ہوئے۔ تمام عملے کو حکم دے دیا گیا کہ جیسے ہی غلام محمد باہر آئیں اسکندر مرزا کو اطلاع کر دی جائے۔ چنانچہ وہ جیسے ہی کمرے سے برآمد ہوتے تھے تو اسکندر مرزا اپنی فائلیں اور کاغذات سمیٹ کر گورنر جنرل ہاؤس سے چلے جاتے۔ اس طرح غلام محمد کو علم نہ ہو سکا کہ وہ چھٹی پر ہیں اور ان کی جگہ کوئی دوسرا شخص ایکٹنگ گورنر جنرل بنا ہوا ہے۔ دو ماہ گزرنے کے بعد آخر انھیں ریٹائر ہونے پر رضامند کر لیا گیا۔ انھیں راضی کرنے کی خدمت چودھری محمد علی اور ان کی بیٹی اقبال بیگم (جن سے بہت محبت کرتے تھے اور ان کی ہر بات مان لیتے تھے) کے سپرد کی۔"

ریٹائر ہونے کے بعد انہیں پورے اعزاز کے ساتھ ان کی بیٹی اقبال بیگم کے گھر بھیجا دیا گیا جو کلفٹن پر رہتی تھیں۔

جب کچھ عرصے بعد غلام محمد کا انتقال ہو گیا تو ان کی وفات کی خبر سن کر جو لوگ تعزیت کے لیے آئے ان میں خواجہ ناظم الدین سرِ فہرست تھے۔ جنھیں غلام محمد نے وزیر اعظم کے عہدے سے غیر آئینی طریقے پر برطرف کر دیا تھا۔

غلام محمد کے دور کو ختم کرنے سے پہلے میں ایم بی خالد صاحب کی کتاب سے ایک اقتباس پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جس پر وہ خود بھی اپنی کتاب میں پوری طرح عمل پیرا نظر آتے ہیں۔

"دراصل ہم اپنے مزاج اور مرضی کے مطابق یا کسی اور وجہ سے یہ طے کر دیتے ہیں کہ کس کو برا کہیں اور کس کو اچھا۔ کس کی خوبیوں کو نظر انداز کرنا ہے اور کس کی برائیوں کو اچھالنا ہے۔ یا کس کی برائیوں کی پردہ پوشی کر کے اس میں خوبیاں تلاش کرنی ہیں۔ ہماری پہلی رائے آخری رائے ہوتی ہے۔ یہ ہمارا قومی مزاج بن چکا ہے۔"

گورنر جنرل غلام محمد اور مس رُوتھ بورل

اسکندر مرزا

اسکندر مرزا کو ایوان صدر میں صرف تین سال رہنے کا موقع ملا یعنی اکتوبر ۱۹۵۵ء سے اکتوبر ۱۹۵۸ء تک

بہر حال جب تک غلام محمد کا سایہ ایوانِ صدر پر چھایا رہا وہاں ایک عجیب قسم کی گھٹن کا احساس رہتا تھا۔ ان کے جانے کے بعد ماحول میں کچھ خوشگوار تبدیلی کے آثار نمودار ہوئے

اسکندر مرزا کا مزاج غلام محمد سے بالکل مختلف تھا۔ وہ کبھی طیش میں نہیں آتے تھے اور بہت ٹھنڈے دل و دماغ کے مالک تھے۔ اپنے پورے اسٹاف سے محبت سے پیش آتے تھے۔ علاوہ اردو اور انگریزی کے انھیں فارسی اور پشتو پر بھی پوری قدرت حاصل تھی اور دونوں زبانیں روانی سے بولتے تھے۔ اسٹاف میں جو لوگ پختون تھے خواہ وہ مالی ہوں یا کوئی اور ان سے پشتو میں ہی گفتگو کرتے تھے۔

قدرت اللہ شہاب ان کے سکریٹری تھے۔ اس دور میں کئی اہم لوگوں کی شادیاں ہوئیں۔ مثلاً خود قدرت اللہ شہاب نے ڈاکٹر عفت سے شادی کی۔ وہ ایک نیک بی بی اور صوم وصلوٰۃ کی پابند تھیں شادی بھی بالکل سادہ طریقہ سے ہوئی تھی۔ بلکہ دوستوں سے تحائف تک نہیں لئے گئے تھے اور ان کے لیے پہلے ہی معذرت کرلی گئی تھی۔

بری فوج کی طرف سے نامزد کئے ہوئے اے۔ ڈی۔ سی کیپٹن سعید احمد نے امریکی سفیر کی لڑکی سے شادی کی۔

پاکستانی نیوی کی طرف سے نامزد اے۔ ڈی۔ سی لیفٹیننٹ سید اقبال امام نے اسکندر مرزا کی بیٹی سے شادی کی۔ یہ لڑکی ان کی پہلی بیوی سے تھیں۔

اسکندر مرزا نے اپنے اسٹاف میں بھی کچھ تبدیلیاں کیں ـــ مثلاً وزارت داخلہ میں اپنے پرائیویٹ سکرٹری نصرت الدین احمد کو اپنا پرسنل سکرٹری مقرر کیا۔

فرخ امین جو مدت سے اسسٹنٹ سیکرٹری کے عہدے پر فائز تھے تبدیل کرکے عبدالوحید کا تقرر کیا گیا۔ یہ صاحب قادیانی تھے۔

اگست ۱۹۵۵ء میں ان کو ایکٹنگ گورنر جنرل بنایا گیا تھا (جیسا کہ اس سے پہلے تذکرہ کیا جا چکا ہے) مارچ ۱۹۵۶ء میں پہلے آئین کا نفاذ ہوا۔ اس وقت انہیں قومی اسمبلی نے اتفاق رائے سے اسلامی جمہوریہ پاکستان کا پہلا صدر منتخب کیا۔

اسکندر مرزا کے ایکٹنگ گورنر جنرل بننے کے ایک ہفتے کے بعد محمد علی بوگرہ کو جو اس وقت وزیر اعظم تھے کو استعفیٰ دینا پڑا اور ان کی جگہ چودھری محمد علی وزیر اعظم بنا دیئے گئے۔ چودھری محمد علی کا سب سے بڑا کارنامہ ۱۹۵۶ء کا آئین تھا جو اسمبلی نے منظور کرلیا تھا اور جس کے ماتحت اسکندر مرزا منتخب صدر بنائے گئے یہ عہدہ گورنر جنرل کی بجائے اب اسلامک ری پبلک آف پاکستان بن گیا تھا۔ اسی زمانے میں ون یونٹ بنا اور پھر ری پبلکن پارٹی وجود میں آئی۔ کچھ ہی عرصہ بعد چودھری محمد علی وزارت عظمیٰ سے مستعفی ہوگئے اور حسین شہید سہروردی کو کولیشن وزارت بنانا پڑی مگر وہ بھی ایک سال سے زیادہ نہ رہ سکے اور ان کے بعد قائد اعظم کے پرانے ساتھی اسماعیل ابراہیم چندریگر تشریف لائے جو صرف دو ماہ وزیر اعظم رہ سکے۔ ان کے بعد دس ماہ کے لئے ملک فیروز خاں نون وزیر اعظم

رہے سپہر اکتوبر ۵۸ء میں مارشل لاء لگا دیا گیا۔

ایم بی خالد صاحب نے اپنی کتاب میں لکھا ہے کہ جنرل ایوب خاں کے مشرقی پاکستان کے دورے کے دوران اسکندر مرزا نے فوج کے انتظامات کو خفیہ طور پر معلوم کرنے کی کوشش کی تھی اسی وقت پاکستان ائیر فورس ماری پور بیس کے کمانڈر ائیر کموڈور عبدالرب کو انہی اور ملک سے وفاداری کا واسطہ دے کر حکم دیا کہ جنرل محمد ایوب خان، جوائنٹ چیفس کیٹی سیکرٹریٹ کے میجر جنرل شیر بہادر اور کراچی کے کمانڈر یحییٰ خان کو ماری پور کے ہوائی اڈے پر پہنچتے ہی گرفتار کر لیا جائے۔

یہ حکم زبانی تھا اور صرف ٹیلیفون پر دیا تھا جسے کموڈور عبدالرب ٹال گئے اور اس طرح اسکندر مرزا کا یہ پلان کامیاب نہ ہو سکا

خالد صاحب کو یہ اطلاع کہاں سے موصول ہوئی اس کا انہوں نے کوئی تذکرہ نہیں کیا۔

بہر حال جب اسکندر مرزا نے مارشل لاء لگایا میں اس دن دفتر میں ان کے سیکریٹری این ڈی احمد (نصرت دین احمد) کے پاس بیٹھا تھا۔ اس وقت صدر کے ڈی ایس پی سیکیورٹی وہاں آگئے اور این ڈی احمد کو مبارکباد دی اور کہا کہ آپ کے صدر پکے صدر بن گئے ہیں اور مارشل لاء لگ گیا ہے۔

اسکندر مرزا نے ایوب خان کو وزیر اعظم نامزد کیا تھا۔ ایک روز ایسا اتفاق ہوا کہ این ڈی احمد کہیں کسی کام سے باہر جا رہے تھے انہوں نے مجھ سے کہا کہ تھوڑی دیر کے لئے میں انکی سیٹ پر بیٹھ جاؤں ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ صاحب Dictation نہیں دیتے جو کچھ لکھنا ہوتا ہے وہ اپنے ہاتھ سے لکھتے ہیں۔ بس ذرا ٹیلیفون کا خیال رکھیے گا۔ وہ ایک خاص قسم کا ٹیلیفون تھا۔ میں اس کے طریقۂ کار سے واقف نہیں تھا۔ وہ انھوں نے مجھے سمجھا دیا اور چلے گئے۔ تھوڑی ہی دیر بعد کسی وزیر کا فون آیا میں نے ملا دیا۔ بات ہو گئی۔ ٹیلیفون بند

ہو گیا۔ مگر بند کرتے وقت میرا ہاتھ غلطی سے کسی سوئچ پر پڑ گیا اور اسکندر مرزا کے کمرے میں گھنٹی بجنے لگی۔

بار بار گھنٹی بجنے سے انہیں غصہ آ گیا انہوں نے چپراسی کو بلا کر ڈانٹا وہ بھاگا ہوا آیا۔ اتفاق سے اسے ٹیلیفون کے کل پرزوں سے کچھ واقفیت تھی اس نے فوراً سوئچ بند کر دیا۔

جب نصرت صاحب واپس آئے تو میں نے انہیں بتایا اور کہا کہ آپ نے خواہ مخواہ میری پوزیشن خراب کرائی اب نہ معلوم وہ مجھے کیا سزا دیں۔ وہ کہنے لگے کہ صاحب زبانی بک بک کرتا ہے۔ مگر دل کا برا نہیں ہے۔ کچھ نہیں ہوگا۔ آپ فکر مند نہ ہوں۔ میں نے شکر ادا کیا کہ یہ واقعہ غلام محمد کے زمانے میں پیش نہ آیا ورنہ میری ملازمت تو اسی روز ختم ہو گئی ہوتی۔

اسکندر مرزا کا خط بہت برا تھا اور پھر وہ ہر چیز خود لکھتے تھے۔ اس کی وجہ سے عملے کو کافی دقت پیش آتی تھی انہیں پینے پلانے کا بھی کافی شوق تھا۔ ان کے زمانے میں ایوان صدر میں ڈنر بہت ہوتے تھے اور اس میں باقاعدہ شراب کا دور چلتا تھا۔ ان کے اوپر ان کی بیگم ناہید خانم کا بہت اثر تھا۔

ناہید خانم پہلے ایرانی سفارت خانے میں کسی افسر کی بیوی تھیں بعد میں اسکندر مرزا سے ان کے راہ و رسم بڑھے اور اتنے بڑھے کر اپنے پہلے شوہر سے طلاق لے کر انہوں نے اسکندر مرزا سے شادی کر لی۔

وہ بڑی سلیقہ مند اور نفاست پسند ایرانی خاتون تھیں اور انہیں گھر کی آرائش و زیبائش اور زینت و سجاوٹ کا بڑا شوق تھا۔ اسکندر مرزا کی پہلی بیگم سے ایک لڑکا ہمایوں مرزا اور دو لڑکیاں تھیں۔ خانم ناہید کے پہلے شوہر کی ایک لڑکی تھی جو کبھی کبھی ایوان صدر میں اپنی ماں سے ملنے آیا کرتی تھی اور کچھ عرصہ وہیں قیام کرتی تھی۔

ناہید خانم کے شوق آرائش نے چند ہی دنوں میں ایوان صدر کا نقشہ بدل کر رکھ دیا۔

اس کا باغ تو اتنا خوبصورت بنا دیا کہ پاکستانی اور غیر ملکی خواتین خاص طور پر باغ دیکھنے آتی تھیں۔ ان کا نظم و ضبط بھی مثالی تھا۔

کھانوں کی میز سے لے کر ملازموں کی یونیفارم تک، ہر ہر چیز پر ان کی نظر رہتی تھی۔ اسٹاف کے تمام ممبران ان کی سلیقہ مندی کے قائل تھے وہ سیاسی معاملات میں بھی اسکندر مرزا کو مشورہ دیتی تھیں۔

ناہید خانم کے بڑے بڑے لوگوں سے بہت اچھے مراسم تھے۔ خاص طور پر تجارت پیشہ افراد سے۔

بہت سے لوگ جنہیں اس بات کا علم تھا کہ ناہید خانم کا اسکندر مرزا پر بہت اثر ہے۔ ان کی معرفت لوگ اپنا کام اسکندر مرزا سے کروالیا کرتے تھے۔

۸ اور ۲۷ اکتوبر کے درمیان کسی دن (مجھے صحیح تاریخ یاد نہیں) میں نے دیکھا کہ کیبنٹ روم کے باہر برآمدہ میں بیگم ناہید اور ایک بڑے تاجر بیٹھے تھے اور بیگم ناہید کسی بات پر انہیں خوب ڈانٹ رہی تھیں۔ اصل بات تو مجھے معلوم نہ ہو سکی البتہ یہ الفاظ میں نے سنے۔

"تم کو معلوم ہے۔ ملک میں مارشل لاء ہے اور میں جب چاہوں تم کو بند کرا سکتی ہوں"

ایم بی خالد نے اپنی کتاب میں اسکندر مرزا کے بارے میں ایک جملہ خاص طور پر لکھا ہے کہ اسکندر مرزا کو ہیڈ دیکھے دار کرنے کی اچھی تربیت حاصل تھی۔ انھوں نے اسکندر مرزا کے کردار کا جو تجزیہ حسب ذیل الفاظ میں کیا ہے کافی دلچسپ ہے۔

"میرا ملک ——— سچا ہو یا جھوٹا"
"میری حکومت ——— سچی ہو یا جھوٹی"
"میری پارٹی ——— صحیح ہو یا غلط"
"میرا دوست ——— سچا ہو یا جھوٹا"

اور آخر میں

"میرا ذاتی مفاد ـــــــــ جائز ہو یا ناجائز"

اس تجزیئے کے پہلے ہی الفاظ یعنی "میرا ملک سچا ہو یا جھوٹا" سے ایک بات ضرور ثابت ہوتی ہے کہ جو کچھ بھی ہو اسکندر مرزا محب وطن تھے۔

یہ اور بات کہ ان کے کردار کی دیگر خامیوں نے غلام محمد کے بعد ملک کو تباہی کے راستے پر آگے بڑھایا۔ اور مارشل لاء کے لئے راستہ ہموار کیا۔

اسکندر مرزا کے آنے کے بعد ایوان صدر کے عملے کی تبدیلی کے ساتھ ساتھ غلام محمد کی پرسنل سیکرٹری مس بورل کی بھی چھٹی کردی گئی۔

اس سلسلے میں قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامے میں لکھا ہے کہ بیگم ناہید نے ایک روز ان سے کہا "مس بورل کو یہاں سے چلتا کردو۔"

اس غیر متوقع فرمائش پر میں کسی قدر حیران ہوا تو وہ بولیں "حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں کامن سنس کی بات ہے، جتنی دیر وہ یہاں رہے گی اتنے ہی زیادہ اسکنڈل بننے کا چانس ہے۔ تم اس دفتر کے انچارج ہو جلد از جلد اسے فارغ کردو لیکن میرا نام بیچ میں نہ آنے پائے۔"

مس روتھ بورل غیر معمولی طور پر حساس اور دور اندیش لڑکی تھی۔ گورنر جنرل ہاؤس میں تبدیلیاں رونما ہوتے ہی عورت کی چھٹی حس نے اسے خبردار کردیا تھا کہ اب اس کا یہاں گزارا ہونا مشکل ہے چنانچہ میرے ہلکے سے اشارے پر اس نے اپنا استعفیٰ پیش کردیا۔ اور چند روز بعد وہ اپنی والدہ کو لے کر پاکستان سے رخصت ہوگئی۔

آخری دنوں میں یعنی سات اور ستائیس اکتوبر کے درمیان بیگم ناہید بہت ناراض تھیں وہ اسکندر مرزا کے اس فیصلے پر بے حد ناخوش تھیں کہ انہوں نے جنرل ایوب خان کو سپریم کمانڈر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنا کر اپنے ہاتھ پاؤں کیوں کٹوائے۔ ان کی رائے میں ایوب خان

اکو ڈپٹی مارشل لا ایڈمنسٹریٹر اور خود صدر پاکستان کو علاوہ سپریم کمانڈر کے چیف
مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہونا چاہیئے تھا۔ کیونکہ ان حالات میں صدر کی پوزیشن ثانوی رہ گئی
بہر حال ہر سربراہ مملکت سے ایک نہ ایک فاش غلطی سرزد ہو جاتی ہے جو اس کے
اقتدار کے خاتمے کا باعث بن جاتی ہے۔

چنانچہ ستائیس اور اٹھائیس کی درمیانی رات کو انقلاب کے اہم کردار جنرل
اعظم خاں اور جنرل برکی اسکندر مرزا سے ان کی سبکدوشی کے کاغذات پر دستخط کرانے آئے
اس موقع پر انقلاب کے ایک اور اہم کردار لیفٹیننٹ جنرل خالد محمود شیخ بھی موجود تھے۔

ایوب خان

اسکندر مرزا نے مارشل لاء لگانے کے سلسلے میں جو اعلامیہ جاری کیا تھا اس کے تحت ۱۹۵۶ء کا آئین منسوخ ہو گیا تھا۔ وفاقی اور صوبائی وزارتوں کو ختم کر دیا گیا تھا۔ قومی اور صوبائی اسمبلیاں توڑ دی گئی تھیں۔ سیاسی جماعتوں کو کالعدم قرار دے دیا گیا تھا اور جنرل ایوب خاں کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور افواج پاکستان کا سپریم کمانڈر مقرر کر دیا گیا تھا۔

جی ایچ کیو کے ایڈووکیٹ جنرل نے اس رائے کا اظہار کیا کہ چونکہ صدر پاکستان جس آئین کے تحت منتخب ہوئے تھے اور جس کے ماتحت انھوں نے حلف اٹھایا تھا۔ وہ آئین ہی جب منسوخ ہو چکا ہے اور اب صدر پاکستان کے اعلامیہ کے مطابق چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور سپریم کمانڈر حکومت اور ملک کے سربراہ تصور کیے جائیں گے۔

ایوب خاں مشرقی پاکستان کے دورے پر چلے گئے تھے۔ اسکندر مرزا نے اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے واپسی پر انہیں گرفتار کرنے کا منصوبہ بھی بنایا تھا جس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں مگر اس میں بھی انہیں ناکامی ہوئی۔ ایوب خاں اب اسکندر مرزا کو زیادہ برداشت کرنے کو تیار نہ تھے۔ پھر ان کے جرنیل بھی ان پر زور ڈال رہے تھے کہ اسکندر مرزا کو فوراً اقتدار سے ہٹایا جائے

آخر وہ مجبور ہو گئے اور ۲۷، ۲۸ اکتوبر کی درمیانی شب کو اسکندر مرزا کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا۔

پھر بھی ان کے ساتھ بہت اچھا سلوک کیا گیا۔ انہیں بحفاظت لندن پہنچایا گیا اور مملکت کی پنشن سے بھی محروم نہیں کیا گیا بلکہ سول سروس کی پنشن بھی دے دی۔

ایوب خان کے برسر اقتدار آنے کے بعد میری ترقی ہو گئی۔ ایک سال کی کم مدت میں ہی میں نے سیکشن آفیسر کا امتحان پاس کر لیا اور ایوان صدر میں ہی سیکشن آفیسر مقرر ہو گیا۔

اکتوبر ۱۹۵۹ء تک ہم سب لوگ کراچی میں رہے۔ ایوب خاں نے دارالحکومت راولپنڈی منتقل کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ چنانچہ صدر کے پورے اسٹاف کو ایک اسپیشل ٹرین سے پنڈی بھیج دیا گیا۔

اس وقت لوگ بہت پریشان تھے۔ کراچی کے مقابلے میں راولپنڈی میں مہنگائی بھی کافی زیادہ تھی۔

سب سے زیادہ پریشان بنگالی تھے۔ کراچی کی آب و ہوا میں وہ آسانی سے گزر کر رہے تھے۔ مگر راولپنڈی کی سخت گرمی اور سخت سردی سے وہ بہت زیادہ پریشان ہو گئے۔ ہم لوگ اکتوبر میں گئے تھے۔ انھوں نے اسی وقت سے کہنا شروع کر دیا کہ جب اکتوبر میں اتنی سردی ہے تو دسمبر جنوری میں کیا حشر ہوگا۔

دوسری بات یہ تھی کہ راولپنڈی مشرقی پاکستان سے بہت دور تھا۔ اور وہاں سے آنا جانا بہت ہی دشوار ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں پہنچنے کے فوراً ہی بعد خاص طور پر بنگالی عملے نے ایوب خاں کو کھلم کھلا گالیاں دینا شروع کر دیں تھیں۔ جس کا میں خود گواہ ہوں اور میں کہتا ہوں کہ علاوہ دیگر عوامل کے دارالحکومت کی تبدیلی بھی مشرقی پاکستان کی علاحدگی کی ایک بڑی وجہ تھی۔

بہرحال راولپنڈی میں پرانے کمانڈر ان چیف ہاؤس کو اس وقت پریذیڈنٹ

ہاؤس بنادیا گیا۔ اس سے ملی ہوئی Murree Brewry کی ایک عمارت تھی وہ حاصل کرکے وہاں سیکرٹریٹ بنایا گیا۔

ایوب خاں کے دونوں بیٹے گوہر ایوب، اور اختر ایوب جو فوج میں کپتان تھے، ایوب خاں کے اے۔ڈی۔سی مقرر کردیئے گئے۔ ان کی ایک صاحبزادی تھیں بیگم نسیم اورنگزیب۔

ایوب خاں کی بیگم بہت نیک اور اچھی خاتون تھیں وہ اکثر میلاد کی مجلس منعقد کرایا کرتی تھیں۔ اور چونکہ وہ پردہ نشین تھیں اس لیئے اسٹاف ممبران کی صرف بیگمات ان محفلوں میں مدعو ہوتی تھیں۔

ایوب خاں نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اسٹاف میں بہت بڑی تبدیلی نہیں کی۔

قدرت اللہ شہاب ان کے سیکرٹری تھے اور ان کی تقاریر وہی لکھا کرتے تھے شہاب صاحب کا خط بہت اچھا تھا۔ اور ان کے لکھے ہوئے کو ٹائپ کرنے میں کوئی دقت پیش نہیں آتی تھی۔ ان کی لکھی ہوئی ساری تقریریں ایم۔بی خالد ٹائپ کیا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ اسٹاف کے تمام لوگ ایک وفد لے کر شہاب صاحب کے پاس گئے اور ان سے کہا کہ ہندوستان میں وائسرائے اور گورنر جنرل کے اسٹاف کو رہائش کی مفت سہولت دی جاتی تھی اور جو اسٹاف وہاں سے آیا تھا انہیں اب بھی یہ سہولت حاصل ہے۔ البتہ جو لوگ پاکستان میں رکھے گئے ہیں وہ اس سہولت سے محروم ہیں اور انھیں اپنے پاس سے کرایہ دینا پڑتا ہے۔ یہ ان کی حق تلفی ہے۔ سب کے ساتھ ایک سا سلوک ہونا چاہیئے اور ان لوگوں کو بھی یہ سہولت ملنا چاہیئے۔ اس سلسلے میں کئی دفعہ کوشش کی گئی مگر کوئی نتیجہ نہیں نکلا آپ مہربان افسر ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ فنانس منسٹری سے کہہ کر آپ یہ سہولت دلوا سکتے ہیں۔ شہاب صاحب نے اس سلسلے میں ان کی مدد کی جس کے نتیجے میں کچھ اسٹاف کو یہ سہولت

مل گئی تھی۔

ایوب خاں عام طور پر ایک اچھے حکمراں کہے جاتے ہیں اور اس میں کوئی شک نہیں کہ انہوں نے ملک کی بہتری کے لئے بہت اچھے، کام کئے مگر ساتھ ہی چند باتیں ایسی کیں جس سے عوام جلد ہی بد دل ہو گئے۔ اور ان کی مخالفت شروع ہو گئی۔

میں ذاتی طور پر علاوہ اور باتوں کے اس کی پانچ خاص وجوہات سمجھتا ہوں اوّل کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں یعنی دارالحکومت کو کراچی سے راولپنڈی منتقل کرنا (اس کا زیادہ اثر بنگالیوں پر پڑا)

• دوسرے انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو فوج سے ریٹائرمنٹ دلا کر بزنس شروع کرادی انہوں نے جنرل موٹرز خریدی اور اس کا نام گندھارا موٹرز رکھ دیا۔ اس سے انکی کافی بدنامی ہوئی۔

• تیسرے ان کا B.D سسٹم یعنی بیسک ڈیماکریسی۔ عوام اس کے بہت خلاف تھے اور اسے عموماً بکس ڈیماکریسی، کہا کرتے تھے۔

• چوتھے محترمہ مس فاطمہ جناح کے ساتھ الیکشن میں ان کا مقابلہ جس میں مس جناح کو شکست ہوئی۔

• اور پانچویں ان کا ۱۹۶۲ء کا آئین جس کے ذریعے صدارتی نظام حکومت رائج کیا گیا۔

الیکشن کے سلسلے میں ان کی بہت زیادہ پبلسٹی کی گئی۔ اور ایوانِ صدر کے تمام عملے کو اس کام میں ملوث کر دیا گیا۔

ہم لوگ مشرقی پاکستان تک گئے۔ جہاں ایک اسپیشل ٹرین چلائی گئی میں نے بھی اس ٹرین میں مشرقی پاکستان کے مختلف حصوں کا سفر کیا۔ اور پبلسٹی

کا کام کیا۔

نہ صرف یہ بلکہ متعدد دانشور اور رائٹرز اخبارات اور رسالوں میں مضامین لکھنے کے لیے ملازم رکھے گئے۔

مثلاً ممتاز مفتی کو آفیسر آن ڈیوٹی رکھا گیا جو ایوب خان کے حق میں مضامین لکھا کرتے تھے۔ شہاب صاحب کے انفارمیشن سیکرٹری مقرر ہونے کے بعد ایک ایسے سیکرٹری آئے جو غیر شادی شدہ تھے اور لوسے صاحب تھے چنانچہ عیدین کے موقع پر دو تین روز کی چھٹی لے لیتے تھے تاکہ اسٹاف سے عید نہ ملنی پڑے۔ بہت کم گو اور تنہا پسند بھی تھے ایک سال قبل ہی چلے گئے وہ اب بھی غیر شادی شدہ ہیں اور تو اور انہیں ریٹائر ہوئے بھی کئی سال ہو گئے۔

۱۹۶۵ء کی لڑائی سے کچھ مدت قبل ایوب خان نے ایس۔ ایم یوسف کو اپنا پرسنل سیکرٹری مقرر کر دیا تھا اور وہ ایوب خان کی تمام تقاریر لکھا کرتے تھے ۱۹۶۵ء لڑائی چھڑنے کے وقت جو تقریر ایوب خان نے کی تھی وہ بھی ایس۔ ایم یوسف نے ہی لکھی تھی۔

یہ تقریر بڑی پر تاثیر ثابت ہوئی تھی۔ اس کے بعد یوسف صاحب فارن سیکرٹری ہو گئے۔ اس زمانے میں مسٹر بھٹو فارن منسٹر تھے اور وہ ایوب خان کے بہت قریب تھے، وہ ایوب خان کو ڈیڈی کہتے تھے اور ایوب خان انہیں My son کہہ کر مخاطب کرتے تھے۔ "بھٹو بہت لائق آدمی تھے اور ڈرافٹنگ کمال کی کرتے تھے۔ بھٹو صاحب ذہانت، فطانت، امنگ اولوالعزمی اور سیماب صفتی کا جیتا جاگتا پیکر تھے"۔

انہوں نے امور خارجہ کا چارج لینے کے بعد جلد ہی اسے ایک نیا ڈھانچہ دینے کی کوشش شروع کر دیں، اور انہی کی کوششوں کے نتیجے میں پاکستان کی خارجہ پالیسی کا جمود ٹوٹا اور کئی راہیں کھلیں۔

ایس ایم یوسف کے فارن سیکرٹری بن جانے کے بعد ان کی جگہ این اے فاروقی ایوب خان

نئے پرنسپل سکریٹری بن کر آ گئے تھے۔ ان کے متعلق مشہور ہے کہ ایوب خان جب انہیں ٹیلیفون کرتے تھے تو وہ سب سے پہلے ٹوپی سر پر رکھ لیتے تھے اور سیٹ سے کھڑے ہو جاتے تھے۔ ان کے سر پر چند بال تھے جنہیں کام کرتے وقت وہ آگے پیچھے کرتے رہا کرتے تھے۔

ان کے متعلق کسی نے ایک مرتبہ ایوب خان کو ایک خط لکھ دیا کہ وہ قادیانی ہیں اور ایوب خان نے ایک قادیانی کو اپنا سیکرٹری بنایا ہوا ہے۔ ایوب خان نے وہ خط پڑھنے کے بعد ان سے پوچھا۔ کہ حقیقت کیا ہے۔

انہوں نے جواب میں کہا تھا کہ

در اصل وہ لاہوری پارٹی کے تھے۔

جنرل پیرزادہ اس زمانے میں ایوب خان کے ملٹری سیکریٹری تھے۔ لیکن جب انہیں دل کا دورا پڑا تو انہیں جی۔ ایچ۔ کیو بھجوا دیا گیا۔ جنرل پیرزادہ کو یہ خیال ہو گیا تھا کہ انہیں ایوب خان کے پاس سے ہٹوانے میں فاروقی صاحب کا بہت ہاتھ تھا۔ اسی لئے بعد میں جب پیرزادہ پاور میں آئے تو انہوں نے فاروقی کو بہت تنگ کیا۔

یہ ہمارا بہت بڑا المیہ ہے کہ ہمارے ملک میں لوگوں میں نہ برداشت ہے نہ وہ معاف کرنا جانتے ہیں۔ اور بعض اوقات صرف مفروضوں پر بدلہ لینے کے لئے ہر قسم کے اقدامات کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ انڈونیشیا کے صدر سیوکارنو پاکستان آئے۔ ان کے اعزاز میں ڈنر کا انتظام کیا گیا۔ جس روز ڈنر تھا اس سے کچھ ہی روز قبل وہاں کی میز کرسیوں پر پالش ہوئی تھی۔ کھانے کے بعد جب مہمانوں نے کرسیوں سے اٹھنے کی کوشش کی تو وارنش ان کے کپڑوں میں چپک گئی۔ ایوب خان کو اس بات پر سخت غصہ آیا اور انہوں نے پی ڈبلیو ڈی کے عملے

کو بلا کر بہت ڈانٹا۔ مگر کسی کے خلاف کوئی اقدام نہیں کیا۔

ایوب خان کے ساتھ بھی ایک دفعہ یہی لطیفہ ہو چکا تھا جب کراچی میں پہلا ٹی۔وی اسٹیشن قائم ہوا تھا تو ایوب خان نے اس پر افتتاحی تقریر کی تھی اس وقت بھی فرنیچر پر نئی نئی پالش ہوئی تھی اور تقریر کرنے کے بعد جب وہ اٹھے تھے تو وارنش ان کی پتلون پر لگ گئی تھی۔ اس وقت زیڈ۔ اے بخاری ٹی۔وی کے مینجنگ ڈائرکٹر مقرر ہوتے تھے۔

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ایوب خاں کے اس واقعہ کے بعد ہی بخاری صاحب کو ٹی۔وی سے ہٹا دیا گیا تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ انہیں ٹی۔وی سے ہٹائے جانے کی وجوہات کچھ اور تھیں۔

ایوب خاں ایک مرتبہ پشاور میں تقریر کر رہے تھے۔ اس وقت ایک لڑکے نے ان پر فائر کیا مگر وہ بچ گئے۔ وہ لڑکا پکڑا گیا۔ اسے اٹک کے قلعے میں قید کر دیا گیا۔ پوچھ گچھ کے دوران اس پر بہت تشدد کیا گیا۔ کچھ دن بعد ایوب خاں کے لڑکے بھی وہاں پہنچے انہوں نے بھی اسکو بہت گالیاں دیں اور مارا بھی افسوس باوجود کوشش کے مجھے پتہ نہ چل سکا کہ آخر اس کا کیا انجام ہوا۔ شاید عمر قید کی سزا ہو گئی ہو گی۔ یا ممکن ہے پھانسی دے دی گئی ہو۔ واللہ اعلم۔

ایوب خاں کے دور میں قدرت اللہ شہاب کی کوششوں سے رائٹرز گلڈ کا قیام ایک بڑا کارنامہ ہے۔ مارشل لاء کی وجہ سے ادیبوں پر بھی طرح طرح کی پابندیاں عائد کر دی گئی تھیں جس کی وجہ سے وہ لوگ بہت برہم تھے جب اخبارات پر بھی کڑا سنسر قائم ہو گیا تو ایک روز صبح سویرے قرۃ العین حیدر قدرت اللہ شہاب کے پاس پہنچیں۔ شہاب صاحب نے اس واقعہ کو اپنی کتاب شہاب نامہ میں اس طرح بیان کیا ہے۔

"قرۃ العین حیدر میرے ہاں آئی، بال بکھرے ہوئے۔ چہرہ اداس، آنکھیں پریشان

آتے ہی بولی۔

"اب کیا ہوگا۔"

کس بات کا کیا ہوگا؟" میں نے پوچھا۔

"میرا مطلب ہے اب ادبی چائے خانوں میں، بیٹھ کر Loose talk کرنا بھی جرم ٹھہرا۔"

"ہاں" میں نے کہا "گپ شپ بڑی آسانی سے افواہ سازی کے زمرے میں آ کر گردن زدنی قرار دی جا سکتی ہے۔"

"تو گویا اب بھونکنے پر بھی پابندی عائد ہے۔" عینی نے بڑے کرب سے پوچھا۔

میں نے مارشل لا کے ضابطے کے تحت بھونکنے کے خطرات و خدشات کی کچھ وضاحت کی تو عینی کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔ ... "ارے بھئی روز روز کون بھونکنا چاہتا ہے۔ لیکن بھونکنے کی آزادی کا احساس بھی تو ایک عجیب نعمت ہے۔" عینی نے کہا۔

پھر ایک روز قرۃ العین حیدر، جمیل الدین عالی، غلام عباس، عباس احمد عباسی، ابن الحسن اور ابن سعید، قدرت اللہ شہاب سے ملنے آ گئے اور ان سے کہا۔

آج کل فوجی حکومت زندگی کے ہر شعبہ میں عوام کی فلاح و بہبود کے اعلانات کرتی ہے۔ کیا وہ ادیبوں کے لئے کچھ نہیں کر سکتی۔؟

قدرت اللہ شہاب نے اس مسئلے پر کچھ دیر گفتگو کی آخر یہ طے پایا کہ سب سے پہلے پاکستان بھر کے ادیب ایک کنونشن منعقد کریں۔ اور وہاں کوئی حتمی فیصلہ کیا جائے۔

بعد میں کچھ ادیبوں نے مل کر چندہ کیا اور ایک اعلان اس کنونشن کو منعقد کرنے

بارے میں جاری کردیا گیا اس میں جن ادیبوں کے نام شامل تھے اس میں قدرت اللہ شہاب کا نام بھی تھا۔

اس سلسلے میں جمیل الدین عالی نے انتھک محنت کی اور آخر ۲۹، ۳۰ اور ۳۱ جنوری ۱۹۵۹ء کو یہ کنونشن کراچی میں منعقد ہوا۔ اس کی سب سے اہم بات یہ ہے کہ اس میں ڈاکٹر مولوی عبدالحق بھی شریک تھے۔

اس میں ہر زبان اور ہر علاقے کے ادیب شامل تھے۔ پھر تمام شرکاء کی رائے سے رائٹرز گلڈ کی بنیاد ڈالی گئی۔

قدرت اللہ شہاب کو اس کا سیکریٹری مقرر کیا گیا۔ سیکریٹری منتخب ہو جانے کے بعد ادیبوں نے اصرار کیا کہ اس کے آخری اجلاس میں صدر ایوب خاں کو ضرور لایا جائے۔

شہاب صاحب نے صدر کے ملٹری سیکریٹری بریگیڈیر نوازش علی سے اس سلسلے میں بات کی تو نوازش علی نے کہہ دیا کہ صدر بہت مصروف اور اس قسم کی ٹٹ پونجیا تقریبات شریک نہیں ہو سکتے۔ پھر شہاب صاحب خود ہی صدر ایوب خاں سے بات کی وہ راضی ہو گئے گو کہ اس روز انہیں بخار ہو گیا تھا مگر وہ پھر بھی شریک ہوئے اور طرفہ یہ کہ انہیں بجائے اسٹیج کے معین کے ساتھ اگلی صف میں بٹھایا گیا۔

اس جلسے کی صدارت ڈاکٹر مولوی عبدالحق نے کی اور اس موقع پر انھوں نے بڑی عالمانہ تقریر کی اس کے اختتام پر انھوں نے ایک شعر پڑھا

بارے دنیا میں رہو غم زدہ یا شاد رہو
ایسا کچھ کر کے چلو یاں کہ بہت یاد رہو

ایک مرتبہ ایوان صدر میں تقسیم اعزازات و خطابات کی تقریب کے موقع پر قدرت اللہ شہاب نے کمال ہوشیاری سے پاکستان رائٹرز گلڈ کے ادبی پرائز (داؤد اور آدم جی انعامات

جیتنے والے ادیبوں کو بھی صدر ایوب کے ہاتھ سے انعامات تقسیم کروائے
اس بات پر بعد میں نوکرشاہی بہت ناراض بھی ہوئی۔ اور آئندہ سے یہ کام
صدر کے سیکریٹری کے بجائے کیبنٹ سیکریٹری سپرد کر دیا گیا۔
جب تک قدرت اللہ شہاب صدر ایوب کے سیکریٹری رہے باوجود
سخت مخالفت کے گلڈ کا کام بحسن وخوبی چلتا رہا۔
مگر جب وہ ملک سے باہر چلے گئے تو مخالفین کی بن آئی اور اس کے بعد
ایوان صدر میں گلڈ کی تقریبات منقطع ہو گئیں۔

اس سلسلے میں جو رائٹرز فنڈ قائم ہوا تھا اس کے لئے ایک کمیٹی قائم کی گئی تھی جس کے
صدر قدرت اللہ شہاب تھے۔ اس فنڈ سے متعلق بہت سا کام میرے سپرد تھا اور اس سلسلے
کی خط وکتابت بھی میرے ذمہ تھی۔

ایوب خاں کے زمانے میں ہندوستان کے ساتھ جو جنگ ہوئی اس کے بہت سے عوامل
تھے۔ اس سلسلے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ شہاب صاحب نے شہاب نامہ میں اس جنگ
کے متعلق ایک عجیب بات لکھی ہے۔

"ایک بار میں نے نواب آف کالا باغ سے اس جنگ کے متعلق دریافت
کرنے کی کوشش کی تو انہوں نے فرمایا۔ "بھائی شہاب، یہ جنگ پاکستان کی
جنگ ہرگز نہ تھی۔ دراصل یہ جنگ اختر ملک، ایم۔ایم احمد، بھٹو، عزیز احمد اور
نذیر احمد نے شروع کروائی تھی۔

جب میں نے پوچھا کہ جنگ شروع کروانے سے ان حضرات کا کیا مقصد تھا تو نواب
صاحب نے جواب دیا۔ "یہ لوگ ایوب خان کو شکنجے میں کس کر اپنی طاقت بڑھانا چاہتے
تھے۔ اس عمل میں اگر پاکستان کا ستیاناس ہوتا ہے تو ان کی بلا سے۔"

اس جنگ کے دوران ہالینڈ، ایران، اور ترکی نے پاکستان کی بہت مدد کی علاوہ ازیں

چین نے بھارت کے ساتھ شمالی سرحدوں پر فوجیں جمع کر کے ہندوستان کو الٹی میٹم دیا جس سے ایک طرف جنگ پر اس کا زبردست اثر پڑا اور اس سے چین کی ہماری دیرینہ دوستی کا عملی ثبوت بھی ملا۔

برخلاف اس کے امریکہ اور برطانیہ کا رویہ بالکل مختلف رہا وہ وقت بے وقت صدر ایوب کو کسی بھی قیمت پر جنگ بند کرنے کا مشورہ دیتے رہتے تھے۔

جنگ کے آخری دنوں میں صدر ایوب اور ان کے وزیر خارجہ جناب بھٹو اختلافات پیدا ہونے شروع ہو گئے۔

صدر ایوب خاں جنگ کے تقاضوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور نظر آنے لگے مگر بھٹو صاحب سیکورٹی کونسل میں جوشیلی تقریریں کر رہے تھے۔ اور ہندوستان کے ساتھ ہزار سال تک جنگ کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔

آخر اس تضاد میں صدر کا پلڑہ ہی بھاری رہا اور ۲۳ ستمبر کو جنگ بندی کا اعلان ہو گیا جنگ بندی کے فوراً بعد ہی روس نے طے کرا دیا کہ جنگ کشمیر سے متعلق معاملات کے سلسلے میں پاکستان اور ہندوستان کی بات چیت تاشقند میں منعقد ہو گی۔

آخر ۳ جنوری ۱۹۶۶ء کو پاکستان کا وفد صدر ایوب کی قیادت میں تاشقند پہنچ گیا۔ اس وفد میں جناب بھٹو بھی شامل تھے۔ ہندوستان کے وفد کی قیادت لال بہادر شاستری کر رہے تھے۔ وہاں آٹھ روز تک مذاکرات جاری رہے۔ ان مذاکرات کے دوران ہندوستان کا رویہ سخت اور بے لچک رہا۔ وہ کشمیر کا ذکر تک سننا نہیں چاہتے تھے۔ جناب بھٹو کا خیال تھا کہ ایسے حالات میں یہ مذاکرات بالکل بے مقصد ہوں گے۔ اور پاکستانی وفد کو بغیر معاہدہ کئے ہوئے واپس چلا جانا چاہیئے۔ شروع شروع میں صدر ایوب اس سے متفق تھے مگر بعد میں روس کے وزیر اعظم مسٹر کوسیجن نے صدر ایوب کو اپنا رویہ بدلنے پر راضی کر لیا۔

جیسا کہ سب کے علم میں ہے کہ اس کے فوراً بعد ہی تاشقند میں شاستری کا ہارٹ فیل ہو گیا۔

قدرت اللہ شہاب نے شہاب نامہ میں لکھا ہے کہ۔

مذاکرات کے دوران کسی نکتہ پر جناب بھٹو نے صدر ایوب خاں کو کچھ مشورہ دینے کی کوشش کی تو صدر ایوب خاں کا پارہ چڑھ گیا۔ انہوں نے غصہ میں جناب بھٹو کو اردو میں ڈانٹ کر کہا۔

"الو کے پٹھے بکواس بند کرو"

بس یہی وہ نکتہ ہے جہاں صدر ایوب اور ذوالفقار علی بھٹو کے راستے الگ الگ ہو گئے۔

وقت کے ساتھ ایوب خاں کا گراف نیچا ہوتا گیا جیسے ملتے میں ہوتی جب وزیر خوراک تھے تو ملک میں چینی کی قلت ہو گئی۔ اس وقت لوگ بڑے پریشان تھے۔ انھوں نے ہوتی کا نام ہی "چینی چور" رکھ دیا تھا۔ اور ساتھ ہی لوگوں نے ایوب خاں کو گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔

ایوب خاں کے خوشامدی انہیں آخری وقت تک یقین دلاتے رہے کہ ملک میں سب ٹھیک ٹھاک ہے۔ حالانکہ ان کے خلاف نفرت اس قدر بڑھ چکی تھی کہ بچہ بچہ انھیں "ایوب خاں مردہ باد" "ایوب خاں کتا" کہتے پھرتے تھے۔

ایک مرتبہ تو ایسا ہوا کہ ایوان صدر میں ایوب خاں نے بہت سے چھوٹے چھوٹے بچوں کو کھیلتے دیکھا اور اس کھیل کے دوران وہ بچے یہی آوازیں لگا رہے تھے "ایوب خاں مردہ باد، ایوب خان کتا" حالانکہ ان بچوں کو شاید ان الفاظ کا مفہوم بھی معلوم نہیں تھا۔ شاید یہ الفاظ انھوں نے اسکولوں میں اپنے ساتھیوں سے سنے ہوں گے۔

ایوب خان کو اپنے پرسنل اسسٹنٹ محمود الحسن پر جنھیں وہ اپنے ساتھ "جی۔ ایچ۔ کیو" سے لائے تھے بہت اعتماد تھا مجھے محمود الحسن نے یہ بات خود بتائی ہے کہ ایوب خان نے مجبوراً حکومت یحییٰ خان کے سپرد کی۔

یحییٰ خان نے ایک روز ان سے کہا کہ ملک اب آپ کے خلاف ہو گیا ہے اور آپ ہٹ جائیے

ہوئے حالات کو کنٹرول نہیں کر سکتے۔

چنانچہ غالباً ۲۵ مارچ ۱۹۶۹ء کو ایوب خان نے محمود الحسن کو ایک خط لکھوایا جس میں انھوں نے یحییٰ خاں سے کہا کہ اب اقتدار آپ سنبھالیں۔ میں آرام کرنا چاہتا ہوں۔

اس وقت وہ بہت افسردہ تھے۔ اور اسی شام ایوب خاں نے ریڈیو اور ٹی۔وی پر قوم سے خطاب کیا اور اقتدار اسی روز یحییٰ خاں کے حوالے کر دیا اسکا لوگوں پر بہت اثر ہوا تھا بلکہ کچھ لوگ تو اس پر رو دئے بھی تھے اس موقع پر ایوب خاں نے کہا تھا۔

"وقت آئے گا کہ لوگ مجھے بہت یاد کریں گے"

میں قدرت اللہ شہاب صاحب کو جانتا ہوں۔ وہ ایک نہایت ایمان دار مخلص اور صاف گو انسان تھے اس لئے ایوب خاں وغیرہ کے بارے میں انہوں نے جو کچھ لکھا ہے اس پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

انھوں نے ایک مضمون سول سروس کے افسروں کی ایسوسی ایشن میں پڑھنے کے لیے لکھا تھا جس کا عنوان تھا "انقلاب کے دس مہینے" اس میں انھوں نے ایوب خاں کے بارے میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ ہمارے ملک کو آج تک جتنے حکمراں ملے ان میں ایوب خان کی کیا حیثیت تھی۔ اس مضمون کا ترجمہ ایم بی خالد صاحب نے اپنی کتاب "ایوان صدر میں سولہ سال" میں شائع کیا ہے۔

میں اس قدر اعتراف کر لینے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتا کہ علامہ اقبال اور قائداعظم کے بعد اگر مجھے کوئی شخص ایسا نظر آیا جس کے سامنے میں خود کو چھوٹا محسوس کرتا ہوں تو لاریب وہ جنرل ایوب خاں ہیں۔ . . . ایوب خاں نے ہمہ مقتدر ہونے کے باوجود اعلیٰ ظرفی اور تدبر کا مظاہر کیا ہے۔ بنیادی مسائل کے صحیح ادراک کی صلاحیت اور حوصلہ، یقین محکم، عمل پیہم، عزم و ہمت، قوت فیصلہ، خلوص اور لگن دوسروں میں پوشیدہ جوہر کا کھلا اعتراف

اور ان کی ہمت افزائی، بلاشبہ یہ وہ خصوصیات ہیں جو صرف ایک عظیم انسان ہی میں یکجا ہوتی ہیں.... ایوب خاں ہمیشہ اپنی ذات سے بلند ہو کر غور و فکر کرنے کے عادی ہیں۔"

"ایوان صدر میں میرا آخری دن" کے عنوان سے انھوں نے ایک اور مضمون میں لکھا ہے "اب جب کہ میں آٹھ برس کے بعد ایوان صدر سے رخصت ہونے والا ہوں تو مجھے محسوس ہوتا ہے کہ میں ایسی دانش گاہ سے جا رہا ہوں جہاں میں نے پہلے چار برسوں میں یہ سیکھا کہ حکومت کرنے کا غلط طریقہ کیا ہے اور بعد کے چار برسوں میں یہ سیکھا کہ حکومت کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے۔"

مگر ساتھ ہی قدرت اللہ شہاب نے ان کے بارے میں ایک اور جگہ یہ بھی لکھا ہے "ان کی طبیعت کی اُفتاد انقلاب پسند نہ تھی نہ انقلاب انگیز تھی۔ ان کے کردار میں میانہ روی اعتدال پسندی، مصلحت اندیشی اور عاقبت طلبی کے عناصر اس قدر غالب تھے کہ کسی شعبے میں بھی انقلاب کا کوئی تقاضا پورا کرنا ان کے بس کا روگ نہ تھا۔ وہ بنیادی طور پر status quo کے آدمی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اصلاحات کے نام پر وہ معمولی سی چھان پھٹک اور جھاڑ پونچھ کے علاوہ کوئی دور رس کارنامہ انجام نہ دے سکے۔

یحییٰ خاں

جب ایوب خاں نے حکومت چھوڑی اس وقت ملک میں آئینی حکومت تھی جو ایوب خاں کے بنائے ہوئے ۱۹۶۲ء کے قانون کے ماتحت کام کر رہی تھی۔

اس وقت یحییٰ خاں فوج کے کمانڈر انچیف تھے۔ جب عنان حکومت ان کے پاس آئی تو انھوں نے نئے سرے سے مارشل لاء لگا دیا اور ایوب خاں کا بنایا ہوا آئین معطل ہو گیا اور پاکستان کی بدبختی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

مارشل لاء نافذ ہونے کے بعد دس دن تک مرکزی سیکرٹریٹ کا کام بالکل معطل رہا کیونکہ حکمران مل بیٹھ کر یا تو آنے والے اقتدار میں حصے بانٹ رہے تھے۔ ہم لوگ روزانہ دفتر جاتے تھے، وہاں جاتے ہی جاتی، گپ شپ ہوتی۔ لوگ طرح طرح کی قیاس آرائیاں کیا کرتے تھے۔ اس دوران حکومت اور سکرٹریٹ کے ملازمین کا رابطہ صرف اخبارات کے ذریعہ تھا۔

کچھ عرصہ قبل ایوب خاں نے جنرل یحییٰ خاں کو فیڈرل کیپیٹل کمیشن کا چیرمین نامزد

کر کے ایک طرح فوج سے الگ کر دیا تھا مگر چند ہی روز بعد انھوں نے شاید خود کو زیادہ محفوظ بنانے کے لیے یحییٰ خاں کو فوج کا کمانڈر ان چیف مقرر کر دیا۔ اس بات پر لوگوں کو بڑی حیرت ہوئی تھی کیونکہ یحییٰ خاں کے کردار سے سب ہی لوگ خوب واقف تھے۔

کمانڈر انچیف بن جانے کے بعد ایسا معلوم ہونے لگا تھا کہ یحییٰ خاں صدر بننے کے خواب دیکھنے لگے تھے۔ جنوری ۱۹۶۸ء میں ایوب خاں پر عارضۂ قلب کا شدید حملہ ہوا جتنے دن وہ بیمار رہے یحییٰ خاں باقاعدہ صدر بننے کی ریہرسل کرتے رہے اور اس کے بعد انھوں نے اقتدار حاصل کرنے کے لئے جوڑ توڑ شروع کر دی۔

میجر جنرل ایس۔ جی۔ ایم۔ ایم پیرزادہ پہلے صدر ایوب کے ملٹری سیکریٹری بنائے گئے تھے لیکن کچھ ہی عرصہ بعد ان پر بھی دل کا دورہ پڑا تھا اور اس وقت انھیں جنرل ہیڈ کوارٹر واپس بھیج دیا گیا تھا (اس کا ذکر میں پہلے کر چکا ہوں) وہاں بھیجے جانے کی وجہ سے وہ بہت ناراض تھے کیونکہ یہ واپسی ان کی مرضی کے خلاف تھی چنانچہ جس روز یحییٰ خاں صدر بنے اسی روز جنرل پیرزادہ پھر ایوان صدر پہنچ گئے۔

یحییٰ خاں نے ایک انتظامی کونسل مقرر کر دی جس میں جنرل عبد الحمید، ایئر مارشل نور خاں اور ایڈمرل احسن شامل تھے۔ مرکزی حکومت کی وزارتیں ان تینوں میں بانٹ دی گئی تھیں۔ اس عرصے میں چند معمولی احکامات جاری کئے گئے مثلاً دفتروں میں حاضری اور وقت پر نہ پہنچنے والوں کی جواب دہی، سڑکوں کی صفائی گندگی اور نالیوں کی صفائی دودھ دہی وغیرہ کی دکانوں پر جالیوں کے لگائے جانے کے احکامات مگر کوئی بھی ٹھوس کام سامنے نہیں آیا۔

بہر حال ۴ اپریل صبح دس بجے صدر پاکستان اور چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر آغا جنرل محمد یحییٰ خاں نے پریذیڈنٹ ہاؤس میں مرکزی سیکرٹریوں اور دیگر اعلیٰ سول حکام سے خطاب کیا۔ اس وقت انھوں نے تمام افسران کو خوب ڈانٹا اور کہا "سارے سول سرونٹس بڑے خوشامدی ہوتے ہیں۔ اور چاپلوسی کر کے ہر نئے حکمران کو غلط راستے پر لگا دیتے ہیں۔ مگر میں

ان باتوں میں آنے والا نہیں ہوں۔ تم لوگوں نے ایوب خاں کو غلط راستہ دکھا کر چلتا کر دیا اس وقت ملک تباہی کے دہانے پر کھڑا ہے اور فوج کے سپہ سالار ہونے کی حیثیت سے ملک کو بچانے کا فرض مجھ پر عائد ہوتا ہے۔" اس کے بعد انہوں نے کہا۔

Those who will not work properly,

I will kick them on their buttocks.

اس کے باوجود کچھ خوشامدی افسروں نے ان کی ہاں میں ہاں ملائی۔ البتہ شہاب صاحب دلیر آدمی تھے۔ انھوں نے کئی سوالات کر ڈالے جس سے یحییٰ خاں ان سے سخت ناراض ہو گئے۔
انہی دنوں شہاب صاحب یونیسکو کے بورڈ کے ممبر منتخب ہوئے تھے۔ اس کا ایک اجلاس پیرس میں ہو رہا تھا وہ اس بورڈ کی میٹنگ میں شریک ہونے پیرس چلے گئے بعد میں انھوں نے اپنی بیوی اور بچے کو بھی وہیں بلا لیا اور وہیں سے اپنا استعفیٰ بھیج دیا۔

ایک سال تک ان کا استعفیٰ منظور نہیں ہوا۔ کیونکہ یحییٰ خاں انھیں پاکستان واپس بلا کر ان کی سرکشی کی سزا دینا چاہتے تھے۔ اس کے بعد ان پر یہ ظلم روا رکھا گیا کہ تین سال تک انھیں پنشن نہیں ملی اور جس طرح انھوں نے وہ دن بڑی تنگی سے انگلستان میں بسر کئے اس کا حال انہوں نے تفصیل سے "شہاب نامے" میں لکھا ہے۔

یحییٰ خاں نے کہا تھا کہ۔۔

"Bring Shahab to Pakistan and

I will deal with him myself".

جس فائل پر انھوں نے یہ الفاظ رقم کئے تھے وہ فائل میں نے خود دیکھی ہے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا۔ بلکہ انہیں لندن سے اغوا کر کے پاکستان لانے کی بھی کوشش کی گئی۔ مگر ان کی قسمت اچھی تھی اور حکومت کی طرف سے جن لوگوں کو اس کام پر معمور کیا گیا تھا انہیں اس کام میں کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔

شرافت حسین شفقت نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔
"آغا یحییٰ خان ابتدا ہی سے اوباش اور عیاش شخص تھا۔ کسی کی عزت محفوظ نہ تھی۔ یحییٰ خاں اور جنرل حمید خاں اور ان کے دوست اعلانیہ شراب پی کر دندناتے پھرتے تھے
اٹھارہ اٹھارہ گھنٹے تک مدہوش رہتے تھے پاکستان کی تمام بدقماش عورتیں ان کی دوست تھیں۔
کرنل غلام سرور کہتے ہیں کہ میں فروری ۱۹۶۶ء میں پاکستان ملٹری اکیڈمی کاکول میں انسٹرکٹر تھا۔ ایک صبح ناشتے کی میز پر میں اور میجر شمس الرحمٰن کلو ناشتہ کر رہے تھے خبر ملی کہ جنرل یحییٰ خاں کو کمانڈر انچیف بنا دیا گیا ہے تو ایک نوجوان افسر نے کہا کہ جب تک میں فوج میں ہوں شادی نہیں کروں گا۔ اس نے کہا کہ میں نے جنرل یحییٰ خاں کا کردار دیکھا ہے۔ وہ مشرقی پاکستان میں میرا جی سی او تھا۔ میں اس کے رویے سے واقف ہوں۔ وہ چوبیس گھنٹے شراب کے نشے میں دھت رہتا ہے افسروں کی بیویوں، ماؤں اور بہنوں کو دیکھ کر ایسی غلط حرکت کرتا ہے جسے دیکھ کر کوئی غیرت مند فوج میں ملازمت نہیں کر سکتا پھر بھی ایسے بے غیرت موجود ہیں جو اس کی غلیظ حرکتوں کو ترقی کی خاطر برداشت کرتے ہیں۔ جنرل رانی جیسی عورت فوج میں ترقی کرواتی ہے۔۔۔۔ مراکش میں اسلامی کانفرنس کے دوران بھری محفل میں پیشاب کر دیا اور الٹیاں کرتے رہے۔ میجر جنرل راؤ فرمان علی کہتے ہیں کہ میں دن کے گیارہ بجے ایوان صدر پہنچا تو یحییٰ جام پہ جام لنڈھا رہا تھا جب کہ اس وقت ڈھاکہ میں خون بہہ رہا تھا اور یحییٰ جام بدست تھا۔۔۔۔
اسی زمانے میں یحییٰ خاں کی بیٹی کی شادی ہوئی۔ اس میں تمام اسٹاف مع بیگمات کے مدعو تھا۔ میں بھی اپنی بیگم کے ہمراہ شادی میں شرکت کے لئے گیا۔ وہاں ایک عجیب بات یہ ہوئی کہ تمام مہمان آ گئے اور سب تیاریاں مکمل ہو گئیں مگر یحییٰ خاں نہیں آئے۔ لوگ طرح طرح کی

باتیں کر رہے تھے۔ ایک خاتون میری بیگم کے برابر بیٹھی ہوئی تھیں انھوں نے کہا اصل بات یہ ہے کہ یہ میرا رشتے کا بھائی ہے ہم لوگ شادی میں شرکت کے لئے پشاور سے آئے ہیں۔ مگر وہ آج اتنی پی گیا ہے کہ اسے کوئی ہوش نہیں ہے اسے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا ہے اور ہوش میں لانے کی کوشش کی جا رہی ہے جب ذرا ہوش درست ہوں گے تب وہ آئے گا اور شادی کی کارروائی شروع ہوگی۔ غرض اس طرح تقریباً دو گھنٹے کی دیر کے بعد بگل وغیرہ بجے اور ان کی آمد کا اعلان کیا گیا۔ پھر شادی کی رسومات مکمل ہوئیں اور ڈنر ہوا۔

جب ہندوستان سے لڑائی ہو رہی تھی اسی دوران میں میڈم نورجہاں کسی طرح لندن سے کراچی پہنچنے میں کامیاب ہوگئیں۔ وہ سیدھی ریڈیو پاکستان آئیں۔ اس زمانے میں طاہر شاہ صاحب ریڈیو پاکستان کراچی کے اسٹیشن ڈائریکٹر تھے۔ نورجہاں نے ان سے کہا کہ وہ کچھ قومی نغمے ریکارڈ کرانا چاہتی ہیں ظاہر ہے اس وقت بڑے خوبصورت نغمے تیار ہو رہے تھے۔ طاہر شاہ صاحب اور ان کا عملہ اس وقت میڈم کے آنے سے بہت ہی خوش ہوا غرض فوراً نغمے حاصل کر کے انھیں تیار کرنے کا بندوبست کیا گیا۔ انہوں نے تین نغمے ریکارڈ کرائے۔

اگلے روز صبح نورجہاں نے اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب سے کہا کہ میں صدر یحییٰ خاں سے ٹیلیفون پر بات کرنا چاہتی ہوں ظاہر ہے طاہر شاہ صاحب اور دیگر عملے کے لوگ پریشان ہوئے کہ وہ کس طرح اس موقع پر صدر کو ٹیلیفون کر سکتے تھے۔

وہ کہنے لگیں "تسی پرواہ نہ کرو فون ملواؤ"۔

بہرحال ان کے پی اے کا نمبر حاصل کر کے ان سے کہا گیا کہ میڈم نورجہاں صدر صاحب سے بات کرنا چاہتی ہیں۔ انھوں نے کہا اچھا ملواتا ہوں۔ تھوڑی ہی دیر میں صدر ٹیلیفون پر آگئے۔ نورجہاں نے کہا۔ "ہیلو جی۔ میں نے تین قومی نغمے ریڈیو پاکستان کراچی میں ریکارڈ کرائے ہیں۔ تسی رات آٹھ بجے سن لینا۔" یہ کہہ کر انہوں نے ٹیلیفون بند کر دیا۔ میڈم نے وقتِ نشر خود متعین کر کے ریڈیو والوں کو مصیبت میں ڈال دیا کیونکہ رات آٹھ بجے خبریں

نشر ہوتی تھیں۔ اب ظاہر ہے اگر صدر صاحب سچ مچ آٹھ بجے ریڈیو لگاتے اور نغمے نشر نہ ہو رہے ہوتے تو سارے متعلقہ لوگ اپنی ملازمتوں سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔ طاہر شاہ نے میڈم سے کہا کہ آپ نے انہیں وقت بھی دے دیا۔ اس وقت تو خبریں نشر ہوتی ہیں۔

میڈم نے کہا کہ "تو کوئی گل نہیں ہے خبریں اس کے بعد ہو جائیں گی"۔

ایک تو خبریں اور وہ بھی جب کہ ملک جنگ لڑ رہا ہو۔ اسٹیشن ڈائریکٹر صاحب کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ انہوں نے گھبرا کر ڈائریکٹر جنرل کو اسلام آباد فون کیا۔ ڈائریکٹر جنرل نے انہیں اطمینان دلایا اور کہا کہ آپ فکر نہ کریں میں صدر کے پی اے کو سمجھا دوں گا۔ خبریں اپنے وقت پر ہی نشر ہوں گی۔ اس کے بعد نور جہاں کے نغمے نشر کر دیئے جائیں۔[1]

اس زمانے میں بہت لوگوں نے زمینیں اور جائیدادیں بنائیں۔ انہی دنوں ایوان صدر میں ایک سیکیورٹی آفیسر تھے۔ وہ اکثر میرے پاس آ کر بیٹھا کرتے تھے۔ انہوں نے ایک روز مجھ سے پوچھا کہ آپ اتنے عرصے سے ایوان صدر میں کام کرتے ہیں، آپ نے کوئی مکان یا پلاٹ اپنے نام الاٹ نہیں کرایا۔ اگر آپ چاہیں تو میں آپ کا یہ کام کرا دوں کیونکہ جنرل رانی کی معرفت یہ کام بڑی آسانی سے ہو سکتا ہے۔ میں نے کہا۔ جی نہیں شکریہ۔ میں نے قائداعظم کے وقت سے لے کر آج تک اپنے لیے کوئی کوٹھی، کوئی مکان یا کوئی زمین الاٹ نہیں کرائی۔ کراچی میں اس وقت پی ای سی ایچ سوسائٹی قائم ہوئی تھی اور اس کے ممبر بننے والے سرکاری ملازمین کو پلاٹ قیمتاً دیئے گئے تھے۔ میرے پاس بس وہی ایک پلاٹ تھا جس پر بعد میں نے ایک چھوٹا سا مکان بنایا۔

---

[1] راقم اس واقعہ کا گواہ ہے کیونکہ میں اس وقت جب نور جہاں نے یحییٰ خاں کو فون کیا اسٹیشن ڈائریکٹر کے کمرے میں موجود تھا۔

جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں۔

جنرل پیرزادہ جنہیں ایوب خاں کے زمانے میں دل کا دورہ پڑا تھا۔ ایوب خاں کے حکم پر جی۔ ایچ۔ کیو بھیج دیئے گئے تھے۔ مگر یحیٰی خاں نے آتے ہی انہیں پھر ایوان صدر میں واپس بلا لیا تھا۔

شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ یحیٰی خاں کو اس بات کا احساس تھا کہ وہ ایک نہایت تجربہ کار اور نمازی پرہیزگار آفیسر ہیں۔

بھٹو صاحب کے پیرزادہ صاحب سے بہت خصوصی تعلقات تھے جنرل پیرزادہ کے ایک پرائیویٹ سیکرٹری تھے مسٹر بخاری جنہیں وہ جی۔ ایچ۔ کیو سے اپنے ساتھ لے آئے تھے وہ بالکل میرے مکان کے قریب ہی سیٹلائٹ ٹاؤن راولپنڈی میں رہا کرتے تھے۔ اس لئے میرے ان سے اچھے مراسم ہو گئے تھے اور وہ ازراہ عنایت مجھے اسٹاف کار میں اپنے ساتھ لے جاتے اور لایا کرتے تھے۔ حالانکہ واپسی میں مجھے ان کی وجہ سے اکثر دیر ہو جاتی تھی کیونکہ وہ دفتر سے اس وقت تک نہیں اٹھ سکتے تھے جب تک پیرزادہ نہ اٹھیں۔ اس دوران میں ہم لوگ بیٹھے باتیں کیا کرتے تھے۔ ایک روز انہیں اٹھنے میں کچھ زیادہ ہی دیر ہو گئی۔ تقریباً دو گھنٹے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آج کیا خاص بات ہے تو انہوں نے بتایا کہ اس وقت جنرل یحیٰی خاں جنرل پیرزادہ اور جناب بھٹو تینوں میں کسی بہت اہم معاملے پر گفتگو ہو رہی ہے بات یہ تھی کہ بہت سے معاملات میں جنرل صاحب جناب بھٹو سے مشورہ لیا کرتے تھے۔

اس وقت تک بہت سے بنگالی افسران موجود تھے اسی زمانے میں ایک بنگالی جوائنٹ سیکرٹری اشرف الزماں تھے۔ ایک روز وہ ایوان صدر آئے اس وقت ہمارے ڈپٹی سیکرٹری دلاور حسن تھے۔ انہوں نے ان سے میرا تعارف کرایا اور کہا کہ یہ قائد اعظم کے زمانے سے یہاں کام کر رہے ہیں ان کو پرانے کاغذات وغیرہ کا جس قدر علم ہے کسی اور کو نہیں ہے۔

جب بھی کسی پرانے کاغذ یا فائل کی ضرورت پڑتی ہے تو ہم ان سے رجوع کرتے ہیں۔ بلکہ ایک مرتبہ تو ہم ان کی وجہ سے بچ گئے ورنہ بڑی گڑبڑ ہو جاتی۔ ہوا یوں کہ ایوب خاں کے زمانے میں کچھ اہم کاغذات کی ضرورت پیش آئی۔ سب لوگوں نے تلاش کئے، مگر وہ نہیں ملے۔

پھر میں نے انہیں مشورہ دیا کہ زبیری سے کہا جائے وہ ضرور کہیں نہ کہیں سے ڈھونڈ نکالیں گے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ میں نے ان کی مدد کی اور آخر کار ہم کامیاب ہو گئے۔

جب وہ کاغذات مل گئے اور ایوب خاں کے پاس بھیج دیئے گئے تو اشرف صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ اتنے پرانے آدمی ہیں اور آپ کو اس قدر باتوں کا پتہ ہے تو آپ ایک کتاب کیوں نہیں لکھتے۔

بلکہ انھوں نے جو جملہ استعمال کیا وہ یہ تھا۔

You are an institution by yourself

ان کا مشورہ تو اچھا تھا۔ مگر میں نے ان سے کہ میں سرکاری ملازم ہوں میں سرکاری راز کتابی شکل میں کیسے پیش کر سکتا ہوں۔ وہ کہنے لگے اچھا خیر ابھی نہ سہی لیکن جب آپ ریٹائر ہو جائیں تو یادداشتیں ضرور لکھیں۔ میں نے ان کی بات گرہ میں باندھ لی۔

جب میں ریٹائر ہو گیا تو اسلام آباد میں ایک روز شہاب صاحب سے ملا انہوں نے بھی مجھ سے کہا کہ "زبیری صاحب آپ نے تو ایوان صدر میں مجھ سے بھی زیادہ وقت گذارا ہے آپ اپنی یادداشتیں ضرور لکھیں اور مجھے خوشی ہے کہ اب یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچ رہا ہے مگر یہ کام میں اکیلا نہیں کر سکتا تھا میری قسمت اچھی تھی کہ کراچی آگیا اور یہاں مجھے جمیل زبیری کا تعاون حاصل ہو گیا۔ اور یہ کتاب انہوں نے تصنیف کر دی خیر یہ تو جملہ معترضہ تھا

سزائے موت پانے والے تمام مجرموں کی فائلیں جنرل یحییٰ خاں کے پاس ان کے احکامات کے لئے بھیجی جاتی تھیں۔

اس کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ فائلیں پہلے میرے پاس آتی تھیں اور ہر کیس پر جو تجویز آتی تھی، میں اس کا ایک صفحہ کا خلاصہ تیار کرتا تھا اور پھر یحییٰ خاں کو بھیج دی جاتی تھی۔

جن معاملات میں یحییٰ خاں کو کوئی دلچسپی ہوتی تھی اس کا خلاصہ واپس آجاتا تھا اور اس کے بارے میں دلاور صاحب کے مشورے کے مطابق دوبارہ خلاصہ تیار کیا جاتا تھا۔

ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھے بڑی مشکل میں ڈال دیا تھا۔ ایک شخص کو عدالت سے پھانسی کی سزا ہوئی تھی۔ اس کے ایک رشتہ دار ایک روز میرے گھر آگئے۔ میں ان سے بالکل واقف نہیں تھا بہرحال میں نے مہمان کے طور پر انھیں بٹھایا اور زحمت کرنے کی وجہ پوچھی۔ وہ کہنے لگے میرے فلاں رشتہ دار کو پھانسی کا حکم ہوگیا ہے آپ اس کو بچا سکتے ہیں۔ میں نے کہا آپ کو یہ کس نے کہہ دیا۔ انھوں نے کہا مجھے بالکل پتہ ہے کہ پھانسی کی ساری فائلیں جو صدر کو جاتی ہیں وہ پہلے آپ کے پاس آتی ہیں۔ میں نے پھر پوچھا کہ آخر آپ کو یہ بات کس نے بتائی۔ وہ بولے میں وزارت داخلہ گیا تھا۔ وہاں مجھے ایک صاحب نے آپ کا نام بتایا ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ بھائی مجھے افسوس ہے میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتا۔ پھر میں کرسی سے کھڑا ہو گیا جب وہ بھی اٹھے تو انھوں نے ایک لفافہ میری میز پر رکھ دیا اور بولے خواہ آپ میرا کام کریں یا نہ کریں میں یہ لفافہ چھوڑے جا رہا ہوں۔

مجھے ان کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا اور میں نے انھیں ایک ڈانٹ پلائی اور کہا کہ آپ اس وقت میرے گھر پر بیٹھے ہیں ورنہ میں آپ کے ساتھ برا سلوک کرتا۔ اٹھایئے یہ لفافہ یہاں سے اور لے جایئے۔

ان دنوں میری بیٹی شہناز میرے پاس آئی ہوئی تھی۔ اس وقت اس کا بچہ عامر کھیلتا ہوا میرے پاس آگیا۔ اب ہم لوگ کمرے سے اٹھ کر باہر آگئے تھے۔ اس نے سو سو روپیہ کے دو نوٹ نکال کر بچے کو دیئے اور کہا "لو بیٹے تم مٹھائی کھالینا" میں نے عامر سے کہا "واپس کر دو یہ روپیہ" مگر اس شخص نے زبردستی وہ نوٹ اس کی جیب میں ٹھونس دیئے۔ میں نے اس کی جیب سے نوٹ نکال کر کیاری میں پھینک دیئے اور ڈانٹ کر کہا "لے جایئے ان نوٹوں کو اور خبردار آئندہ اس قسم کی حرکت نہ کریں ورنہ ..."

آخر نوٹ اٹھا کر منہ لٹکائے ہوئے وہ شخص واپس چلا گیا۔

اگلے روز دفتر جا کر میں نے اس کی فائل دیکھی۔ اسے کورٹ سے پھانسی کی سزا ہوئی تھی بعد میں جنرل یحییٰ نے اس کی تصدیق بھی کر دی اور اسے پھانسی ہوگئی۔

ذوالفقار علی بھٹو

جناب بھٹو کی ولادت ۵ جنوری ۱۹۲۸ء کو صبح تقریباً ۳ بجے شہر لاڑکانہ میں ہوئی۔ بھٹو خاندان کا تعلق راجستھان کے راجپوت خاندان سے تھا۔ ذوالفقار علی بھٹو شاہ نواز بھٹو کی دوسری بیوی خورشید بیگم کے پہلے بیٹے تھے جن سے شاہنواز بھٹو نے محبت کرکے شادی کی تھی۔ یہ شادی ۱۹۲۴ء میں ہوئی۔ اس سے قبل جبکہ ذوالفقار علی بھٹو کی عمر صرف ۱۳ سال تھی اور وہ ابھی اسکول ہی میں تعلیم حاصل کر رہے تھے کہ ان کی شادی احمد خاں بھٹو کی صاحبزادی شیریں امیر بیگم سے ہوگئی۔ شیریں کی عمر اس وقت ۲۳ سال تھی۔

بھٹو نے لاس اینجلز کی یونیورسٹی آف کیلیفورنیا اور برکلے یونیورسٹی میں اپنی اعلیٰ تعلیم مکمل کی۔ بھٹو کو تاریخ، فلسفہ اور بین الاقوامی تعلقات سے خاص دلچسپی تھی انہوں نے سقراط، افلاطون، ارسطو، جے ایس مل، ،،،، جے۔ جے لاسکی، ہابز، میکاؤلی اور ٹائن بی کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ ۱۹۵۰ء میں وہ برکلے سے سیاسیات میں آنرز کی ڈگری لے کر پاکستان واپس آگئے۔ شرافت حسین شفقت کے مطابق اس زمانے میں نصرت بھٹو کراچی میں، ۷۰ کلفٹن کے قریب رہتی تھیں اور بھٹو کی چھوٹی بہن منور الاسلام کی سہیلی تھیں۔ اسی توسط سے

۸ ستمبر ۱۹۵۱ء کو جناب بھٹو اور محترمہ نصرت بھٹو کی شادی ہوگئی۔

جناب بھٹو نے قانون کا پیشہ اختیار کیا اور سندھ کے معروف وکیل رام چند ڈنگول کے اسسٹنٹ کی حیثیت سے اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔

۱۹۵۷ء میں اسکندر مرزا نے جناب بھٹو کو اقوام متحدہ کی جنرل اسمبلی کے بارھویں اجلاس میں پاکستانی وفد کا رکن بنا کر بھیجا جہاں انہوں نے جارحیت کے موضوع پر بڑی مدلل تقریر کی۔

فروری ۱۹۵۸ء میں وہ ایوب خاں کی کابینہ میں وزیر تجارت مقرر ہوئے بعد میں وہ وزیر اطلاعات، قومی تعمیر اور اقلیتی امور مقرر ہوئے۔

۱۹۶۲ء کے ایوب خاں کے بنائے ہوئے دستور کے ماتحت جب نئی کابینہ بنی تو اس میں مسٹر بھٹو اینڈ صنعت، پانی اور قدرتی وسائل کے وزیر بنا دیئے گئے۔ محمد علی بوگرہ کے انتقال کے بعد جناب بھٹو وزیر خارجہ ہوگئے۔

یہ بات سب ہی لوگ جانتے ہیں کہ جب ۱۹۶۵ء میں پاکستان اور ہندوستان کی جنگ ہو رہی تھی تو اس کے آخری دنوں میں صدر ایوب اور جناب بھٹو کے درمیان اختلافات پیدا ہونا شروع ہوگئے تھے۔ حالانکہ شروع میں بھٹو صاحب کے ایوب خاں سے بہت گہرے مراسم تھے یہاں تک کہ جناب بھٹو انہیں ڈیڈی کہتے تھے۔ ایوب خاں جنگ کے تقاضوں کے سامنے ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو رہے تھے۔ مگر بھٹو صاحب سیکیورٹی کونسل میں ہندوستان کے ساتھ ہزار سال تک جنگ کرنے کی باتیں کر رہے تھے۔

آخر ۲۳ ستمبر کو جنگ بندی کا اعلان ہوگیا۔ اس کے بعد ہی روس نے یہ طے کرا دیا کہ جنگ اور کشمیر کے متعلق معاملات کے سلسلے میں پاکستان اور ہندوستان کی بات چیت تاشقند میں کی جائے۔

انہی دنوں ویت نام کے مسئلے پر روس اور امریکہ ایک پالیسی پر متفق ہوگئے تھے۔

اس لئے وہ نہیں چاہتے تھے کہ پاکستان اور بھارت میں کشیدگی رہے کیونکہ یہ ان کے مفاد میں نہیں تھی جبکہ جناب بھٹو تاشقند کے سمجھوتے میں کشمیر کا واضح حل چاہتے تھے۔

بھارتی صحافی درگاداس نے اپنی کتاب "انڈیا فرام کرزن ٹو نہرو" میں لکھا ہے کہ وزیر خارجہ ذوالفقار علی بھٹو نے اعلان تاشقند کے سوویت مسودہ پر بہت سے اعتراض کئے اور اسے سبوتاژ کرنے کی کوشش کی یہاں تک کہ ایوب خاں نے اپنے ہاتھ سے یہ لکھ دیا کہ دونوں ممالک ایک دوسرے کے خلاف طاقت استعمال نہیں کریں گے تو جناب بھٹو نے اس مسودے کو واپس سوویت حکام کی طرف بھیجتے ہوئے ایوب خان کے لفظ اس میں سے مٹا دیئے۔ سوویت حکام اس پر بڑے جز بز ہوئے اور انہوں نے یہ ٹھان لیا کہ جناب بھٹو کیونکہ نووارد وزیر خارجہ ہیں اس لئے انھیں دخل نہیں دینے دیں گے۔

"جناب بھٹو کا رویہ اس پورے عمل سے جارحانہ اور افسردہ رہا" اس معاہدے کے بعد جناب بھٹو اور صدر ایوب خاں کے راستے جدا ہو گئے۔

"اسلام، آرمی، امریکہ" میں لکھا ہے کہ ممتاز فلسفی برٹرینڈ رسل نے ایک مضمون میں لکھا کہ۔ بھٹو اپنے ملک میں اسی قومی روایت کے لیڈر ہیں جس کے حامل جناب محمد علی جناح تھے۔ رسل نے متعدد ایشیائی اور کمیونسٹ ممالک کے لیڈروں کو خطوط لکھے کہ وہ جناب بھٹو کی مدد کریں"۔

حکومت سے علیحدہ ہونے کے بعد جناب بھٹو کی مقبولیت عوام میں دن بہ دن بڑھتی گئی اور

۳۰ نومبر ۱۹۶۷ء کو لاہور میں ڈاکٹر مبشر کی رہائش گاہ پر پاکستان پیپلز پارٹی کی بنیاد رکھی گئی جناب بھٹو کو اس کے پہلے کنونشن میں جو حیدرآباد میں منعقد ہوا تھا پہلا چیئرمین منتخب کیا گیا۔

جناب بھٹو بہت ہی ذہین آدمی تھے، بہت پڑھے لکھے تھے۔ وہ جس زمانے میں کراچی میں بیرسٹری کر رہے تھے اسی وقت سے ان کی شہرت ہو گئی تھی۔ ان کی ذاتی لائبریری میں

بہت کتابیں موجود ہیں۔ شہاب صاحب نے "شہاب نامے" میں اسکندر مرزا کے زمانے کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک روز اسکندر مرزا نے ان سے کہا کہ ایوان صدر کی لائبریری میں سندھ کے متعلق جو بہت سی کتابیں ہیں۔ جناب بھٹو انہیں دیکھنا چاہتے ہیں۔ انہوں نے مجھے ہدایت کی کہ میں ٹیلیفون کر کے اس نوجوان کو اپنے پاس بلاؤں اور ایوان صدر کی لائبریری سے استفادہ کرنے کے لئے کہوں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ اور وقت مقررہ پر ایک شوخ اور سیماب صفت نوجوان میرے کمرے میں وارد ہوا مسٹر بھٹو میں بلا کی ذہانت اور فطانت تھی اور انہیں بہت سے علوم اور ان کے اظہار پر حیرت انگیز عبور حاصل تھا۔ چند ہی روز میں انہوں نے ایوان صدر کی تمام لائبریری کو کھنگال ڈالا۔

جناب بھٹو نے اقتدار سنبھالنے کے بعد اپنے اسٹاف میں کچھ تبدیلیاں کیں۔ مثلاً اعظم قریشی جو لندن چلے گئے تھے انہیں واپس بلا کر اپنا پرائیویٹ سیکرٹری بنایا۔ ان سے بھٹو صاحب کے گہرے مراسم تھے۔ میں نے اکثر انہیں ساتھ ساتھ لان میں ٹہلتے ہوئے دیکھا ہے کبھی کبھی بھٹو صاحب ان کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر ان سے بات چیت کرتے تھے۔

شروع شروع میں اعظم صاحب نے اسٹاف کے ساتھ سخت رویہ رکھا۔ مگر جب اس بات کا احساس ہو گیا کہ کام تو انہی لوگوں سے لینا ہے۔ اور انہیں کے ساتھ دن رات واسطہ رہے گا تو پھر ان کا انداز بدل گیا۔

چودھری فضل الہٰی پریذیڈنسی جو کہ مال روڈ پر تھی میں قیام پذیر تھے اس کی دیوار پر کسی نے شرارت سے لکھ دیا کہ "چودھری فضل الہٰی کو رہا کرو" چونکہ پریذیڈنسی میرے آفس کے راستے میں پڑتی تھی اس لئے میں نے خود بھی یہ لکھا دیکھا ہے یہ بات چودھری صاحب کے اسٹاف نے ان کو بتائی سنا ہے یہ سن کر وہ مسکرائے اور پھر ڈپٹی کمشنر سے کہہ کر دیوار کو فوری طور پر صاف کرا دیا گیا۔

بھٹو صاحب اپنے ذاتی ملازم جس کا نام نور محمد مغل تھا اپنے ساتھ لے آئے تھے۔ وہ نورا

کے نام سے مشہور تھا۔ اس کا بہت اثر تھا۔ کیونکہ وہاں کا بہت پرانا ملازم تھا۔ وہ اکثر دنیروں اور وزرائے اعلیٰ سے ٹیلیفون پر بات کیا کرتا تھا اور کبھی کبھی کسی کی سفارش بھی کر دیا کرتا تھا

جس زمانے میں بھٹو صاحب وکالت کرتے تھے اس وقت ایک صاحب زاہد حسین ان کے پاس تھے۔ بھٹو صاحب کی یہ بڑائی تھی کہ وہ انھیں بھولے نہیں اور انہیں اپنا پرسنل سیکرٹری بنا کر بلا لیا۔ ان کے کھانے پینے کا انتظام بھی ایوان صدر سے ہوتا تھا۔ بھٹو صاحب ان کا بہت خیال کرتے تھے اور تمام احکامات انہی کو لکھواتے تھے۔ بھٹو صاحب بے انتہا محنتی آدمی تھے وہ روزانہ رات گئے تک کام کرتے اور زاہد حسین کو اس وقت تک رکنا پڑتا تھا جب تک مسٹر بھٹو اٹھ نہ جائیں۔ وہ اکثر فائلوں پر اپنے ہاتھ سے طویل نوٹ تو نہیں لکھتے تھے مگر دلچسپ ریمارکس دے دیتے تھے۔ مثلاً جنرل رضا کو جنھیں وزارت خارجہ میں سیکرٹری ایڈمنسٹریشن مقرر کیا گیا تھا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد دو مرتبہ ملازمت میں توسیع مل چکی تھی جب تیسری مرتبہ ان کی ملازمت میں توسیع کا کیس بھٹو صاحب کے پاس آیا تو انھوں نے اس پر لکھا۔

Let him die in the chair.

شکر کا ایک کارخانہ قائم کرنے کے سلسلے میں ایک فائل اس وقت کے وزیر مالیات ڈاکٹر مبشر حسن نے انھیں بھیجی۔ یہ کیس کافی دن سے چل رہا تھا مگر کارخانہ قائم نہیں ہوا تھا اور دیر پہ دیر ہو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر بھٹو صاحب کو بہت غصہ آیا اور انہوں نے اس فائل پر لکھا

I am not Khwaja Nazimuddin who could be befooled like that. Let me know the exact that when this will will be comissioned.

یہ ریمارکس لکھ کر فائل ڈاکٹر مبشر حسن کو واپس بھیج دی۔

بھٹو صاحب کو اچھا لباس پہننے کا بہت شوق تھا اور وہ ہمیشہ بہت اچھے کپڑے پہنا کرتے تھے۔ ان کی دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ اپنے اسٹاف کا بہت خیال کرتے تھے۔

جس زمانے میں الیکشن ہونے والا تھا تو اسٹاف کو بہت رات گئے تک کام کرنا ہوتا تھا۔ جن لوگوں کو رات تک رکنا ہوتا تھا۔ ان کے لئے پرائم منسٹر ہاؤس میں کھانے کا انتظام کیا جاتا تھا۔

بھٹو صاحب خود بھی رات کو اکثر دفتروں کا چکر لگا کر دیکھتے تھے کہ کون کون لوگ کام کر رہے ہیں۔ اس وقت ان کے سکریٹری افضل سعید اور راؤ رشید جوان کے اسپیشل سیکریٹری تھے ان کے ساتھ ہوتے تھے۔ اس طرح انھیں اپنے پورے اسٹاف کے بارے میں پوری اطلاعات حاصل ہو جاتی تھی اور وہ صحیح اندازہ لگا لیتے تھے کہ کون کون کام کر رہا ہے۔

الیکشن کے نتائج معلوم کرنے کے لئے پرائم منسٹر ہاؤس میں بہت اعلیٰ انتظامات کئے گئے تھے اور خاص مشینیں نصب کی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ انتظامات کے سلسلے میں ہال پر ایک پارٹی سیکریٹریٹ بنایا گیا تھا اور ہر صوبے سے پارٹی ورک کے لئے ایک ایک افسر آن اسپیشل ڈیوٹی مقرر کیا گیا تھا۔ مگر چونکہ صوبۂ پنجاب بڑا صوبہ تھا اس لئے اس کے واسطے دو مقرر ہوئے تھے یہ او ایس ڈی وزیر اعظم سکریٹریٹ میں پیپلز پارٹی سیل میں کام دیکھنے جاتے تھے۔

ان کے اس سکریٹریٹ میں بٹھانے کی خاص وجہ یہ تھی کہ بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ ان کا سارا کام خود ان کی اور افضل سعید صاحب کی نگرانی میں ہو۔ ان او ایس ڈی کی نگرانی اور کنٹرول کے لئے بھٹو صاحب نے تمن صاحب کو مقرر کیا تھا جو اسپیشل اسسٹنٹ فار پولیٹیکل آفیئرز مقرر ہوتے تھے۔ انتظام یہ تھا کہ صوبوں سے تمام رپورٹیں افضل سعید صاحب کے پاس آتی تھیں۔ پھر وہ انھیں تمن صاحب کے پاس بھیجتے تھے اور وہ پھر بھٹو صاحب کو پیش کرتے تھے۔

ایک روز تمن صاحب نے مجھے بلایا اور پوچھا "زبیری صاحب کیا آپ نے کبھی

علی گڑھ میں پڑھا ہے۔"

میں نے کہا۔" جی ہاں میں نے مسلم یونیورسٹی ہائی اسکول سے میٹرک کیا تھا۔"

انہوں نے سن دریافت کیا۔

یہ سن کر وہ بہت خوش ہوئے اور کھڑے ہو کر مجھ سے گلے ملے اور کہنے لگے کہ اسی سال میں میں بھی اسی اسکول میں پڑھتا تھا۔ پھر انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کے وائس چانسلر ڈاکٹر ضیاء الدین (جو میرے اور جمیل زبیری کے عزیز تھے) کے بارے میں پوچھا۔ بلکہ وہ ان کے بیٹے جو نواب میاں کہلاتے تھے ان کے بارے میں بھی پوچھتے رہے۔

تمن صاحب مجھ پر بہت مہربان تھے اور میرا بہت خیال کرتے تھے۔ ایک روز انہوں نے مجھ سے پوچھا" آپ کے تمام رشتہ دار تو علی گڑھ میں پڑھتے تھے۔ پھر آپ نے میٹرک کے بعد وہاں یونیورسٹی میں داخلہ کیوں نہیں لیا؟"

میں نے انھیں بتایا

میں نے کہا سنہ ۱۹۳۷ء میں "در اصل میں کامرس پڑھنا چاہتا تھا اور اس وقت یونیورسٹی میں کامرس نہیں تھی۔ اس لئے میں نے انٹر کامرس تو بریلی سے کیا۔ مگر چونکہ اس زمانے میں سینٹ جانس کالج آگرہ میں زبیریوں کی شہرت تھی اس لئے میں نے وہاں داخلہ لے لیا۔ اور بی کام وہیں سے کیا۔ مسرت حسین زبیری مجھ سے کچھ عرصے پہلے وہاں سے تعلیم مکمل کر کے جا چکے تھے۔"

تمن صاحب زبیری خاندان کے بہت سے افراد سے واقف تھے انھوں نے مجھ سے ڈاکٹر

۔ راقم نے بھی اسی کالج سے بی اے کیا اور ریلی بری ہوسٹل کے اسی کمرے میں مقیم رہا جس میں مجھ سے پہلے میرے ماموں مسرت حسین زبیری رہا کرتے تھے۔

عترت حسین زبیری اور مسرت حسین زبیری کے بارے میں بھی گفتگو کی۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ دفتر میں تین صاحب سے اکثر نجی گفتگو بھی ہوتی رہتی تھی۔

چونکہ بھٹو صاحب اپنے اسٹاف اور افسران کا بہت خیال رکھتے تھے اس لئے انہوں نے سب کو زمینیں الاٹ کرائیں۔ تمام ممبران سے پوچھا گیا تھا کہ وہ کہاں زمین لینا چاہتے ہیں۔ کسی نے اسلام آباد میں کسی نے لاہور میں اور کسی نے کراچی میں لکھ دیا۔ میں نے بھی کراچی لکھا تھا۔ جتنے ممبران نے کراچی میں زمین مانگی تھیں۔ ان سب کو

Provisional allotment.

دے دیا گیا تھا۔ یہ قطعہ اراضی ڈرائیو ان سینما کے پاس تھی۔ بعد میں پتہ لگا کہ وہ زمین کافی گڑھے میں تھی۔ اور اگر اس کا قبضہ لے لیا جاتا تو اس کی بھرائی بہت مہنگی پڑتی چنانچہ ایسے سب لوگوں نے متبادل زمین کی درخواست دی۔ وہ کیس کافی دن تک چلتا رہا۔ مگر چونکہ ہماری قسمت میں نہیں تھی اس لئے اس معاملے کا فیصلہ ہونے سے پہلے مارشل لاء لگ گیا اور وہ معاملہ ہی ختم ہو گیا۔

البتہ جن لوگوں کو اسلام آباد اور لاہور میں زمینیں الاٹ ہوئی تھیں، وہ فائدے میں رہے۔

چونکہ مارکیٹ میں گاڑیاں بہت مہنگی تھیں اس لئے بھٹو صاحب نے بہت سے افسران کو گاڑیوں کا پرمٹ بھی دلوایا۔ مگر افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ بہت سے لوگوں نے گاڑیاں لے کر بلیک میں فروخت کر دیں۔ میں نے کوئی پرمٹ حاصل نہیں کیا۔

مجھے علم ہے کہ بعد میں جب جنرل ضیاء الحق اقتدار میں آ گئے تو ان افسران کے خلاف انکوائری شروع ہوئی تھی۔ مگر چونکہ ان میں سے زیادہ تر کو یا تو ملازمت سے نکال دیا گیا تھا یا وہ خود چھوڑ کر بیرون ملک چلے گئے تھے اس لئے معاملہ آگے نہیں بڑھ سکا۔

بھٹو صاحب کی یادداشت بہت اچھی تھی۔ وہ جس طرح اپنے ساتھ کام کرنے والوں کو

نہیں ہو لیتے تھے۔ اسی طرح اگر انہیں کسی سے شکایت ہو جاتی یا کسی کی کوئی بات بری لگی ہوتی تو اسے بھی وہ فراموش نہیں کرتے تھے اور آسانی سے معاف نہیں کرتے تھے۔

اسی سلسلے میں مجھے ایک واقعہ کا علم ہے جو اس وقت اٹامک انرجی کمیشن کے چیئرمین آئی ایچ عثمانی نے بتایا تھا۔

ایک مرتبہ کناڈا کے وزیر اعظم ٹروڈو (جو عثمانی کے کلاس فیلو تھے) اسلام آباد آ رہے تھے۔ اسی زمانے میں کناڈا کی امداد سے کراچی میں ایٹمی بجلی گھر (KNUPP) تیار کیا گیا تھا۔ عثمانی صاحب نے کہا۔

"میں نے یہ سوچ کر کہ وہ اسلام آباد آ ہی رہے ہیں انھیں کراچی آنے کی دعوت دیدی اور کہا آپ (KNUPP) بھی دیکھ لیجیے گا۔ وہ راضی ہو گئے۔ مگر انھوں نے کہا کہ وہ کراچی کا یہ دورہ بالکل نجی رکھنا چاہتے ہیں۔ اسکو سرکاری نہ بنایا جائے۔"

عثمانی صاحب نے ان کے لئے صدر کے ایک ہوٹل کی چھت پر ڈنر کا انتظام کیا جس میں صرف اپنے گھر کے لوگ۔ اور چند دوست مدعو تھے۔ البتہ سیکورٹی کے خیال سے وہاں کچھ سپاہیوں کی ڈیوٹی لگوا دی۔ لیکن بات چھپ نہ سکی اور سب کو اس کی اطلاع ہو گئی۔ یہاں تک کہ گورنر اور چیف منسٹر سندھ کو بھی اطلاع ہو گئی۔ ان لوگوں نے پروٹوکول کا خیال کر کے اس ڈنر کو سرکاری بنا دیا۔ بہر حال ڈنر ہو گیا۔ عثمانی صاحب نے ٹروڈو سے بہت معذرت کی۔

بھٹو صاحب اس زمانے میں فارن منسٹر تھے۔

عثمانی صاحب نے بتایا۔

"بعد میں میں سروس سے علیحدہ ہو کر امریکہ چلا گیا اور وہاں ایک یونیورسٹی میں پڑھانے لگا۔

کچھ عرصہ بعد جب بھٹو صاحب وزیر اعظم بن گئے تو ایک مرتبہ وہ امریکہ کے دورے پر

آئے ہیں یہ سوچ کر کہ میرے ملک کا وزیر اعظم آرہا ہے میں بھی ایر پورٹ پہنچ گیا۔ وہاں ان سے ملاقات ہوئی۔ پھر وفد کے دیگر لوگوں کے ہمراہ میں ہوٹل چلا گیا۔ جہاں وہ ٹھہرے تھے۔ میں باہر بیٹھ کر کچھ دیر انتظار کرتا رہا کہ وہ شاید مجھ سے ملنا چاہیں مگر جب انھوں نے نہیں بلوایا تو چونکہ میں ان کے entourge میں شامل نہیں تھا اس لئے اپنا پتہ اور ٹیلیفون نمبر ان کے سیکرٹری کو دے کر اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ اگر وہ مجھے بلائیں تو فون کر دیجئے گا۔

کئی گھنٹے گزرنے کے بعد انھوں نے مجھے طلب کیا۔ سیکرٹری نے انہیں بتایا کہ وہ چلے گئے ہیں۔

انھیں یہ بات بہت ناگوار گزری۔ بہر حال انھوں نے مجھے بلوایا اور مجھ سے ملاقات کی۔ کافی دیر ادھر ادھر کی باتیں ہوتی رہیں۔ اسی دوران میں انھوں نے مجھ سے کہا "مسٹر عثمانی آپ کو یاد ہے کہ ایک مرتبہ آپ نے ٹروڈو کو کراچی مدعو کر کے انھیں ڈنر دیا تھا۔ مگر مجھے مدعو نہیں کیا تھا۔

میں نے انہیں بتایا کہ مسٹر ٹروڈو کراچی کے اس دورے کو بالکل پرائیویٹ رکھنا چاہتے تھے مگر بات افشا ہو گئی میں نے اسلام آباد سے کسی کو بھی مدعو نہیں کیا تھا۔ اس وقت بھٹو صاحب کے چہرے پر بڑے ناگواری کے اثرات تھے۔ انھوں نے تلخ لہجے میں کہا کہ بہر حال میں فارن منسٹر تھا اور آپ کو پروٹوکول کا خیال رکھنا چاہیئے تھا۔۔ اب وقت گزر چکا تھا اور میں ملازمت چھوڑ کر امریکہ چلا آیا تھا۔ اس لئے یہ بات ختم ہو گئی۔ میں نے ملازمت کیوں چھوڑی یہ علیحدہ قصہ ہے۔"

• جناب بھٹو پاکستان میں اپنے ہر اس ہم عصر کو انفرادی طور پر پوری طرح جانتے تھے جن کی

ٹ یہ واقعہ آئی ایچ عثمانی نے راقم کو خود سنایا تھا۔

کوئی بھی معاشرتی، علمی یا سیاسی اہمیت تھی۔ وہ ایسے افراد کی تعلیم، شجرہ، نسب اور اثر و رسوخ سے پوری طرح باخبر رہتے تھے۔"

ان کی شخصیت بڑی سحور کن تھی۔ مادر زبان و قلم بڑا ردواں تھا۔ شیخ وقار احمد کا کہنا تھا کہ جناب بھٹو جس سے بھی متاثر ہوتے ہیں وہ اس کا اظہار برملا کرتے ہیں۔

انہوں نے بہت سوچ بچار کر کے ملک میں مختلف ہفتے منانے کا انتظام کرایا۔ جب سروس ویک منایا گیا اس وقت انہوں نے تمام اسٹاف ممبران کو ایک پارٹی دی۔ اس میں انہوں نے ایک مختصر تقریر کی اور اس ہفتے کو منانے کی ضرورت اور اہمیت کو اجاگر کیا۔ اسٹاف کے کام کی تعریف بھی کی اور ۲۰ گریڈ تک کے افسران کو ایک ماہ کی تنخواہ بطور بونس دینے کا اعلان کیا۔

جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آجانے کے بعد افضل سعید صاحب کو بے ایمانی کے ایک کیس میں بند کر دیا گیا تھا۔

اس کی تفصیل یہ ہے کہ دراصل افضل سعید صاحب، مارشل لاء لگنے سے تقریباً ڈیڑھ سال پہلے ریٹائر ہو گئے تھے۔ مگر بھٹو صاحب نے تین سال کے لئے انہیں دوبارہ ملازمت میں رکھ لیا تھا۔ مارشل لاء لگنے کے بعد ان کی ملازمت ختم کر دی گئی۔ ان کے پاس کچھ secret funds رہا کرتے تھے۔ ان پر الزام لگایا گیا تھا کہ انہوں نے اس فنڈ میں کچھ گڑبڑ کی ہے۔ اس لئے انہیں پہلے اسلام آباد میں ایک کوٹھی میں نظر بند رکھا گیا اور ان کے بیانات وغیرہ لئے گئے اور انکوائری ہوئی۔ اس زمانے میں ان پر کافی سختی ہوتی رہی شروع میں تو بیوی بچوں تک سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ مگر بعد میں ملنے کی اجازت دیدی گئی تھی اور کھانا بھی گھر سے آنے لگا تھا۔ انکوائری کے بعد جب کوئی بات ثابت نہ ہو سکی تو انہیں رہا کر دیا گیا اور وہ کراچی منتقل ہو گئے تھے۔

ریٹائرمنٹ کے بعد جب میں کراچی منتقل ہو گیا تو ایک مرتبہ میں ان سے ملنے ان کے دفتر گیا۔ وہ یہاں بی سی سی آئی فاؤنڈیشن میں سیکرٹری جنرل مقرر ہو گئے تھے کیونکہ حسن عابدی صاحب

سے ان کے بہت اچھے مراسم تھے۔

خدشہ کے بارے میں انہوں نے مجھے بتایا کہ دراصل ان کے ایک ماتحت دلاور حسن ڈپٹی سیکریٹری نے ان کو پھنسوایا تھا۔ وہ خود تو بچ گئے اور ساری ذمہ داری ان پر ڈال دی۔ انہوں نے کہا کہ دلاور حسن وہی شخص تھا جس کو میں نے بھٹو صاحب سے کہہ کر کئی دفعہ ملازمت میں توسیع دلوائی۔ نہ صرف یہ بلکہ توسیع کے دوران میں ان کو جوائنٹ سیکریٹری بنوایا جو کہ واحد مثال ہے۔ کیونکہ اصولاً کسی افسر کو بھی توسیع کے دوران میں ترقی نہیں دی جاتی۔

میں نے انہیں بتایا کہ دلاور حسن نے ہمیشہ اپنے ماتحتوں کو کافی پریشان کیا اور اپنے افسران کی ہمیشہ بہت خوشامد کی اور ناجائز فائدے اٹھائے۔ میں نے انہیں ایک لطیفہ بھی سنایا۔ "شاید آپ کو یاد ہوگا ایک مجید صاحب سیکشن آفیسر تھے ایک روز انہوں نے مجھے بتایا کہ ایک رات تقریباً دو بجے انہوں نے دلاور حسن کو خواب میں دیکھا اور اس کے بعد خوف سے پھر رات بھر نیند نہیں آئی۔"

دراصل دلاور حسن ہائی بلڈ پریشر کے مریض تھے اور ہر وقت غصے میں رہتے تھے اور بلاوجہ ڈانٹ ڈپٹ کرتے رہتے تھے۔ ان کے متعلق مشہور تھا کہ وہ کسی روز ہنس دیں تو بارش ہو جاتی ہے۔

بہر حال انہوں نے کچھ عرصے ڈاکٹر عترت حسین زبیری کے ساتھ کام کیا تھا اور چونکہ ڈاکٹر عترت میرے عزیز تھے اور ایجوکیشنل ایڈوائزر تھے اس لئے دلاور حسن کا رویہ میرے ساتھ قدرے نرم رہتا تھا۔

ایک روز افضل سعید صاحب نے آئی ایچ قریشی کو جو ایڈمنسٹریشن کے جوائنٹ سیکریٹری تھے، اور مجھے بلوایا اور ہم سے کہا کہ وزیر اعظم چاہتے ہیں کہ ان کی صاحبزادی محترمہ بے نظیر بھٹو پرائم منسٹر سیکریٹریٹ میں بیٹھیں اور کچھ کام کریں۔ تاکہ انھیں تجربہ حاصل ہو۔

لہٰذا ایک کمرے کا ان کے لئے انتظام کرنا ہے۔ پھر کمرہ ایسا ہونا چاہئے جس میں ہر طرح کی سیکیورٹی بھی ہو۔

مگر دقت یہ تھی کہ اس وقت سکریٹریٹ میں کوئی کمرہ خالی نہیں تھا۔ قریشی صاحب نے مجھ سے رائے مانگی (میں اس وقت ڈپٹی سیکریٹری ایڈمنسٹریشن تھا) میں نے کہا یہاں عزیز احمد صاحب (وزیر خارجہ) کا ایک کمرہ ہے اور وہ بہت اچھی طرح مزین بھی ہے وہ یہاں تو بہت ہی کم آکر بیٹھتے ہیں۔ زیادہ تر وزارت خارجہ میں ہی اپنے کمرے میں بیٹھتے ہیں۔ افضل سعید صاحب ان سے اجازت لے کر بے نظیر صاحبہ کے وہاں بیٹھنے کا انتظام کر سکتے ہیں۔ چنانچہ میری یہ تجویز منظور ہو گئی۔

سکریٹریٹ افضل سعید صاحب نے یہ بات بھٹو صاحب کو بتائی۔ پھر عزیز احمد صاحب سے اجازت حاصل کر لی گئی۔ وہ کمرہ ہم سب نے دیکھا۔ اس کے سامان میں تھوڑی بہت تبدیلی کی ضرورت تھی۔ وہ کمرہ ویسے بڑا موزوں تھا۔ اس کے ساتھ اٹیچ باتھ بھی تھا۔ اور ساتھ ہی پی اے کا کمرہ بھی تھا۔ بے نظیر صاحبہ کے لئے ایک پی اے کا بندوبست بھی کر دیا گیا تھا۔ ایک روز انھوں نے یہ کمرہ خود بھی آکر دیکھا اور انتظامات سے مطمئن ہو گئیں۔

ہماری یہ بات چیت ۲ جولائی ۱۹۷۷ء کو ہوئی تھی مگر پیشتر اس کے وہ اس کمرے میں آکر بیٹھتیں ۵ جولائی کو مارشل لاء لگ گیا۔

وقت اور تاریخ جیسے علامہ اقبال نے قسمت کہا ہے عجیب چیز ہے۔ اس وقت کیا معلوم تھا کہ بے نظیر صاحبہ کا اس چھوٹے سے کمرے میں نہ بیٹھنا کیا معنی رکھتا ہے۔ ان کے لئے تو قضا و قدر نے کچھ اور ہی سوچ رکھا تھا۔ وہ کمرہ انہی کے لئے مخصوص کیا جا چکا تھا جس میں وزیر اعظم خود بیٹھتے تھے۔ قدرت کے کھیل عجیب ہیں کسی کو پتہ نہیں ہوتا کہ آئندہ کیا ہونے والا ہے۔

میں یہاں ایک عجیب واقعہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ مارشل لاء لگنے سے تقریباً ایک ماہ

پیشتر میں ایک روز افضل سعید صاحب کے پی اے کے پاس بیٹھا تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل ضیاء الحق کی ایک لڑکی معذور ہے۔

"میں نے تو یہ بات کبھی نہیں سنی"

اس پر انھوں نے مجھے بتایا کہ ان کی ایک عرضی کل ہی بھٹو صاحب کے پاس آئی ہے جس میں لکھا ہے کہ وہ اپنی معذور بیٹی کا علاج سرکاری خرچ پر لندن میں کرانا چاہتے ہیں۔ ساتھ اس کی والدہ شفیقہ ضیا بھی جائیں گی۔ اس کی اجازت دیدی جائے۔

اس پر بھٹو صاحب نے نہ صرف اجازت دے دی بلکہ عرضی پر یہ بھی لکھا کہ علاوہ اس کی ماں کے ایک ذاتی ملازم کو بھی بھیجا جائے۔

اور ستم ظریفی دیکھئے کہ جس وقت مارشل لا لگا۔ اور جنرل ضیاء نے بھٹو صاحب کو قید کر دیا۔ اس وقت بھی جنرل ضیاء کی بیٹی زین اور ان کی بیگم محترمہ شفیقہ ضیاء لندن میں۔ اور اس بچی کا علاج سرکاری خرچ پر ہو رہا تھا۔

میں نے پہلے ذکر کیا تھا کہ بھٹو صاحب دفتر میں رات تک بیٹھے فائلیں دیکھا کرتے تھے اور بہت محنت کرتے تھے۔ انھوں نے ۴ اور ۵ جولائی کی درمیانی شب کو بھی اسی طرح کام کیا بلکہ مارشل لاء لگ جانے کے بعد بھی جس کا ان کو علم ہو چکا تھا وہ کام کرتے رہے۔ اس وقت ان کے پاس پھانسی کی سزا پانے والوں کے کئی کیس تھے۔ انہوں نے ان سب کی پھانسی کی سزا کو عمر قید کی سزا میں بدل دیا تھا۔

یہاں بھی وہی قضا و قدر کا مسئلہ سامنے آجاتا ہے۔ انھوں نے کئی لوگوں کو اپنے نوک قلم سے سردار پر پہنچنے سے بچا دیا مگر خود ان کی قسمت میں وہیں پہنچنا لکھا تھا جس کے لئے کوئی کچھ نہ کر سکا۔

"محترمہ بے نظیر بھٹو نے جب ۲۱ جون ۱۹۷۸ء کو اپنے والد سے پھانسی کی کوٹھری میں ملاقات

کی تو جناب بھٹو نے مسکراتے ہوئے کہا

"پنکی اب جنرل ضیاء کبھی الیکشن نہیں کرائے گا کیونکہ تم ۲۵ برس کی ہو چکی ہو۔۔۔

جناب بھٹو نے یہ اندازہ جیل کی کوٹھری میں بیٹھ کر لگایا جبکہ ایوان اقتدار میں حقیقتاً یہ بحث شروع ہو چکی تھی کہ اسمبلی کے الیکشن میں شرکت کے لئے عمر کی حد پچیس کی بجائے تیس سال مقرر کرنے کے لئے آئین میں ترمیم کی جائے۔"

یہ اقتباس شرافت حسین شفقت کی کتاب "اسلام آرمی امریکہ" سے لیا گیا ہے۔ اس کی صداقت کے بارے میں مجھے ذاتی طور پر کوئی علم نہیں۔

اپریل میں جب جناب بھٹو کو پھانسی دی جانے والی تھی ان کی بیگم نصرت بھٹو اور محترمہ بے نظیر بھٹو کو سہالہ ریسٹ ہاؤس میں نظر بند کر دیا گیا تھا۔۔۔ ۳ اپریل کو ماں بیٹی کو جناب بھٹو سے آخری ملاقات کے لئے قید خانے میں لایا گیا۔"

اس موقع پر محترمہ بے نظیر کی خواہش تھی کہ وہ اپنے عظیم باپ کا الوداعی بوسہ لے سکیں لیکن بیچ میں آہنی سلاخیں حائل تھیں انہوں نے جیل سپرنٹنڈنٹ یار محمد سے کہا، پلیز دروازہ کھول دیں۔

I want to kiss my father

لیکن یار محمد مجبور تھے۔ وہ ایسا نہیں کر سکتے تھے۔ جیل کا انتظام اس وقت سیکیورٹی کے تحت تھا۔ اس ملاقات میں بیگم نصرت بھٹو سے خاندانی مسائل اور محترمہ بے نظیر بھٹو سے قومی اور بین الاقوامی مسائل پر بات چیت ہوئی۔

یہ ملاقات تین گھنٹے جاری رہی شام کو تقریباً ساڑھے پانچ بجے، ان خواتین کو دوبارہ واپس سہالہ کیمپ پہنچا دیا گیا۔

"سرکاری اعلان کے مطابق جناب بھٹو کو اسی رات ڈیڑھ بجے پھانسی دے دی گئی۔ تارا مسیح نے لیور دبایا۔ ڈاکٹر اصغر علی شاہ نے موت کی تصدیق کی، بلیک وارنٹ

پر جیل سپرنٹنڈنٹ یار محمد نے حسب معمول لکھا "مجرم کو پھانسی پر لٹکا کر مار دیا گیا"۔
بشیر احمد خاں مجسٹریٹ نے اس پر تائیدی دستخط کئے۔ مولوی حیات محمد نے میت کو غسل دیا
اور فاتحہ پڑھی۔ مجید قریشی نے جناب بھٹو کے جیل میں موجود اثاثے کو اپنی تحویل میں لے لیا۔
اور سی ۱۳۰ فوجی طیارے میں جناب بھٹو کی لاش کو گڑھی خدا بخش کے لئے روانہ کر دیا گیا۔
بھٹو صاحب نے اپنے دور اقتدار میں جو سب سے بڑا کام کیا شاید وہ شملہ سمجھوتہ تھا
جس کی بنا پر انہوں نے نہ صرف ہندوستان سے ہمارے ملک کی چھینی ہوئی زمین واپس لے لی
بلکہ نوے ہزار پاکستانی قیدیوں کو چھڑا لیا اور وہ وطن واپس آ گئے۔ ان کے ایک اچھے سیاستدان
ہونے کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ انہوں نے پہلے ہندوستان سے اپنے علاقے واپس لئے
اور بعد میں فوجی کیونکہ ظاہر ہے ہندوستان ۹۰ ہزار فوجیوں کو کیمپوں میں رکھ کر کب تک کھلا
سکتا تھا۔
مگر جس طرح ہر حکمران ایک نہ ایک زبردست غلطی کرتا ہے وہی بھٹو صاحب نے کی اگر
وہ اسمبلی کے الیکشن دوبارہ کرا دیتے تو شاید وہ اور بھی زیادہ سیٹیں حاصل کر لیتے اور تو
سیاسی پارٹیاں مل کر بھی انہیں شکست نہیں دے سکتی تھیں۔ ان کی دوسری بڑی غلطی اپنے
آپ کو بغیر مقابلہ منتخب کرانے کا خیال تھا۔ ویسے بھی ان سے الیکشن میں کوئی نہیں جیت سکتا
تھا لیکن نہ معلوم ان کے ذہن میں کیا بات تھی جس کی وجہ سے انہوں نے خود کو بلا مقابلہ
منتخب کروایا۔ قدرت اللہ شہاب نے "شہاب نامے" میں ایک جگہ لکھا ہے
"اپنی پہلی ملاقات ہی سے وہ مجھے "آپ صاحب" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے وزیر
اعظم اور صدر کی حیثیت سے بھی انہوں نے اس اسلوب تخاطب کو بڑی وضعداری سے نبھایا
ان کے عروج کے آخری دور میں بہت سے وزیروں اور اعلیٰ افسروں کو اکثر یہ شکایت رہتی
کہ بھٹو صاحب کابینہ اور دوسری میٹنگوں میں ان کے ساتھ بڑی سختی، بدسلوکی اور ہتک آمیز
رویہ سے پیش آتے ہیں۔ لیکن ذاتی طور پر مجھے کوئی ایسا تجربہ نہیں ہوا۔ میں جیسا "آپ صاحب"

شروع میں تھا ویسا ہی آخر تک رہا۔"

جناب بھٹو نے اپنی ایک تحریر میں دوستوفسکی کے ایک ناول سے اقتباس نقل کیا تھا:

"انسان کی سب سے قیمتی متاع جو اسے ملتی ہے اور ایک ہی بار ملتی ہے۔ وہ اس کی زندگی ہے اس کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ اسے اس انداز سے جی کر دکھائے جس میں بزدلی اور بے لطف ماضی کی کوئی ندامت موجود نہ ہو۔ پس انسان زندہ رہے تو ایسے رہے کہ اسے بے مقصد اذیتیں نہ سہنی پڑیں اور مرتے وقت وہ فخر سے کہہ سکے کہ میری تمام تر زندگی اور میری تمام تر قوت کائنات کے عظیم ترین مقصد کے لئے صرف ہوئی ہے اور وہ مقصد نوع انسانی کی آزادی ہے"

جنرل محمد ضیاء الحق

۴، اور ۵ جولائی ۱۹۷۷ء کی درمیانی شب میں جنرل ضیاء الحق نے مارشل لاء لگا دیا
ہم معمول کے مطابق صبح اٹھے اور دفتر جانے کی تیاری کی۔ مگر ہمیں لینے کے لئے جو اسٹاف
کار آیا کرتی تھی وہ نہیں آئی۔ اسی دوران میں ہمارے دفتر کے ایک چپراسی نے ٹیلیفون کیا اور
مجھ سے کہا کہ صاحب میں جیل کے سامنے جو کچہری ہے وہاں سے بول رہا ہوں۔ اس سے آگے
فوج کھڑی ہے اور کوئی مجھے آگے نہیں جانے دے رہا۔

میں نے دفتر میں کئی جگہ فون کرنے کی کوشش کی مگر شاید اس وقت تک سارے
فون کاٹے جا چکے تھے۔ کافی دیر بعد اسٹاف کار آئی اس میں ریاض الرحمٰن جو اس وقت جوائنٹ
سکریٹری ایڈمنسٹریشن تھے بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم دفتر کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے سے اخبار کا
ایک ضمیمہ خریدا اس میں مارشل لاء لگنے کے متعلق ایک مختصر سی خبر تھی۔ چونکہ ہماری کار پر پرائم منسٹر
سکریٹریٹ کی پلیٹ لگی ہوئی تھی اس لئے اسے کسی فوجی نے نہیں روکا۔ دفتر پہنچ کر معلوم ہوا کہ

سوائے بریگیڈیئر ملک کے تمام ٹیلیفون کاٹ دیئے گئے ہیں ملک صاحب بھٹو صاحب کے دور اقتدار میں اوایس ڈی تھے مگر چونکہ ان کا تعلق فوج سے تھا شاید اس لئے ان کا فون بحال رکھا گیا۔

اس روز دفتر میں کوئی کام نہیں ہوا۔ کسی کو کچھ پتہ نہیں تھا کہ کیا کرنا ہے۔ کون رہے گا اور کون نکالا جائے گا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی۔

بھٹو صاحب کو مع ان کے ساتھیوں اور کچھ سیاستدانوں کو گرفتار کر کے مری پہنچا دیا گیا تھا۔ شروع کے پندرہ دنوں تک مارشل لاء حکام کا رویہ بھٹو صاحب کے ساتھ بہت اچھا رہا مگر اس کے بعد حالات بدلنا شروع ہو گئے۔

پرائم منسٹر سیکرٹریٹ کا نام بدل کر چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر سیکرٹریٹ رکھ دیا گیا۔ جتنے فوجی افسران تھے ان کے دفاتر کچھ عرصے کے لیے ایک پرائیوٹ کوٹھی میں قائم کئے گئے یہ وہی کوٹھی تھی جس میں پہلے جنرل ٹکا خاں کا دفتر تھا۔

بریگیڈیئر ملک کا دفتر بالکل میرے دفتر کے سامنے تھا۔ ان سے میرے اچھے تعلقات ہو گئے تھے۔ کبھی میں ان کے دفتر چلا جاتا تھا اور کبھی وہ میرے پاس آجاتے تھے۔

ایک روز وہ کہنے لگے کہ جنرل صاحب نے نوے دن میں جو الیکشن کرانے کا وعدہ کیا ہے اور کہا ہے کہ میں اس کے بعد اقتدار عوامی نمائندوں کو منتقل کر دوں گا۔ آپ کا اس کے بارے میں کیا خیال ہے۔ میں نے کہا۔

"بات یہ ہے بریگیڈیئر صاحب جو کوئی بھی اقتدار میں آتا ہے۔ اس کے اطراف خوشامدیوں کا ایک ٹولہ فوراً اکٹھا ہو جاتا ہے جو اسے سبز باغ دکھا کر زیادہ سے زیادہ وقت اقتدار میں رہنے کی ترغیب دیتا ہے۔ پھر اس کا ذہن بھی اسی طرح سوچنے لگتا ہے چاہے شروع میں اسے یہ خیال نہ بھی ہو۔ اور اسی وجہ سے میں سمجھتا ہوں کہ نوے دن کے اندر الیکشن نہیں ہوں گے

میں نے اس معاملے میں بریگیڈیئر صاحب سے بحث کی اور کہا کہ میں یہ تو نہیں کہتا کہ

وہ نوے سال حکومت کریں گے۔ البتہ میں اپنے طویل تجربے کی بناء پر یہ ضرور کہہ سکتا ہوں کہ یہ نوے سال سے پہلے جانے والے نہیں ہیں۔

مگر وہ خود بھی فوجی تھے۔ انھوں نے میری بات سے اتفاق نہیں کیا۔ میں نے کہا "بہر حال یہ تو وقت ہی بتائے گا۔"

اس کے کچھ ہی عرصے بعد جب کچھ سول افسران ایوان صدر سے علیحدہ کئے گئے۔ ان کے ساتھ بریگیڈیئر صاحب کی بھی چھٹی کر دی گئی۔

کوئی چھ یا سات ماہ بعد وہ ایک روز مجھے راولپنڈی کے صدر کے علاقے میں مل گئے اور خود مجھ سے کہنے لگے کہ "زبیری صاحب شاید آپ کا خیال صحیح تھا۔ نوے دن تو گزر چکے۔ اب آئندہ دیکھیں کتنے دن کا پروگرام ہے؟"

الیکشن بار بار ملتوی کرنے کی وجہ سے لوگوں نے C.M.L.A. کا مطلب

Cancel my last announcement.

مارشل لاء لگنے کے کچھ عرصے بعد ایک روز میں قدرت اللہ شہاب صاحب جن سے میری اچھی واقفیت تھی، ملنے ان کے گھر گیا تو انھوں نے مجھے بتایا کہ مارشل لا لگنے کے تقریباً پینتیس روز بعد مجھے ایک روز جنرل صاحب نے اچانک بلوایا اور وزارت تعلیم سنبھالنے کے احکامات دیئے۔ اس واقعہ کا ذکر شہاب صاحب نے "شہاب نامے" میں کیا ہے۔

انہوں نے لکھا ہے "مارشل لاء لگنے کے تقریباً پینتیس دن بعد جنرل ضیاء الحق نے مجھے اچانک طلب کر کے وزارت تعلیم کا کام سنبھالنے کے احکامات دیدیئے مگر میں نے اپنی ضعیف العمری اور ریٹائرڈ زندگی کی آرام پسندی کی عادت اور کچھ عرصہ کے لئے لندن جا کر اپنے دوست ابن انشاء کی عیادت کے عذر پیش کئے اس کے باوجود جنرل ضیاء الحق نے مجھے ڈاکٹر افضل جو اس وقت وزارت تعلیم کے سیکریٹری تھے کے ہمراہ لندن بھجوا دیا۔ وہاں سے واپسی پر بھی ضیاء الحق صاحب نے یہ بات نہیں بھلائی تھی۔ مجھے تشویش تو ضرور لاحق ہوئی مگر میں خاموشی سے کان لپیٹ

کر اسلام آباد میں بیٹھا رہا۔ اسی دوران چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر مملکت جنرل ضیاء الحق کو اپنی مرضی کے نورتن مل گئے۔ میں ان کا تہہ دل سے شکر گذار ہوں کہ انھوں نے نہ تو اس موضوع پر پھر کوئی بات چھیڑی اور نہ کسی قسم کی ناراضگی کا اظہار کیا۔"

مسٹر بھٹو نے آٹھ جرنیلوں کو نظر انداز کر کے جنرل ضیاء الحق کو ترقی دی تھی۔ ۵ جولائی کے انقلاب میں خاص کردار جنرل چشتی کا تھا۔ جنرل چشتی ضیاء صاحب کے ابتدائی رفقا میں تھے۔ جنرل صاحب نے شروع ہی سے یہ اندازہ لگا لیا تھا کہ انھیں دیر تک اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے اسلام کا نعرہ لگانا ضروری ہوگا۔ یوں بھی وہ ذاتی طور پر نماز روزہ کے پابند تھے اور اسلام سے حقیقی معنوں میں محبت رکھتے تھے۔ لیکن انہوں نے اسلام کے نام پر جس طرح حکومت چلانے کی کوشش کی اس میں انہیں بری طرح ناکامی ہوئی۔ ہمیشہ کی طرح ان کے اطراف بھی خوشامدیوں کا ایک ٹولہ جمع ہو گیا جو انہیں خادم اسلام 'مرد مومن' اور مرد حق وغیرہ کے ناموں سے پکارتا تھا۔ اور عوام میں بھی یہی نعرے لگواتا تھا۔ آہستہ آہستہ ان کے دل میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ ملک میں نفاذ اسلام کا کام صرف وہی کر سکتے ہیں۔ ایک مرتبہ صحافیوں سے خطاب کرتے ہوئے انھوں نے کہا تھا۔

"اگرچہ مجھے عوام نے منتخب نہیں کیا لیکن خداوند بزرگ و برتر نے ہمیں یہ ذمہ داری سونپی ہے کہ ہم پاکستان کو اسلام کا قلعہ بنا دیں اور ہم اس وقت تک اقتدار نہیں چھوڑیں گے جب تک یہ کام مکمل نہیں ہو جاتا۔"

میں نے ابھی جنرل چشتی کا ذکر کیا تھا۔ وہ جس وقت چیف آف اسٹاف تھے تو جنرل عارف ان کے ماتحت کام کرتے تھے۔

ایک روز کے ایم عارف نے سیکرٹریٹ کا دورہ کیا۔ اس دن ان سے میرا تعارف کرایا گیا ایک کرنل صاحب ان کے ساتھ تھے۔ انہوں نے تعارف کراتے ہوئے کہا کہ "یہ مسٹر ایف اے زبیر ہیں۔ بہت سینیئر آفیسر ہیں اور قائد اعظم سے لے کر آج تک مختلف سربراہوں کے ساتھ کام کر

رہے ہیں" اس پر جنرل عارف نے کہا۔
"جی ہاں مجھے واقفیت ہے۔ میں زبیری خاندان کے بہت سے افسران کو جانتا ہوں۔
میں نے کہا۔
"مجھے یاد ہے آپ جنرل یحییٰ کے زمانے میں بھی کچھ عرصے اس سیکرٹریٹ میں رہے ہیں
اس وقت آپ کرنل ہوتے تھے۔ میں نے یہاں بڑا وقت گذارا ہے۔ میرے سامنے یہ
تیسرا مارشل لاء لگا ہے۔"
جنرل عارف بڑے محتاط اور کم گو آدمی تھے انہیں شعر و شاعری سے بھی کافی لگاؤ
تھا (بعد میں ان کا دیوان بھی شائع ہوا تھا)۔
جنرل ضیاء الحق سیکرٹریٹ کی مسجد میں ظہر کی نماز پڑھنے بڑی پابندی سے آتے
تھے۔ میری ان سے علیک سلیک ہو جایا کرتی تھی۔ وہ کبھی خیریت دریافت کر لیا کرتے تھے۔
ان دنوں ان کے ساتھ بہت سے لوگ نماز پڑھنے آیا کرتے تھے جس میں فوجی افسران بھی
شامل تھے۔ لیکن میں نے دیکھا ہے کہ اگر کسی روز جنرل صاحب جی ایچ کیو وغیرہ چلے
گئے اور ظہر کی نماز کے لئے وہاں نہیں آئے تو بہت سے لوگ نماز سے غائب ہو جاتے تھے۔
یہ بات عام مشہور تھی کہ بہت سے لوگ وہاں صرف جنرل صاحب کی خوشنودی کے لئے نماز
پڑھنے آتے تھے اور ان میں بہت سے ایسے بھی تھے جو بغیر وضو کے ہی نماز میں شریک ہوتے تھے۔
خیر اس کے بارے میں مزید کیا لکھنا۔ یہ تو اب ہماری قوم کا کردار بن چکا ہے اور
اس قسم کے منافق لوگوں کی کہیں کمی نہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ جنرل صاحب خود نماز
کے بڑے پابند تھے اور تہجد تک کی نماز پابندی سے ادا کرتے تھے۔ ان کی طبیعت میں بہت
انکساری تھی۔ اور وہ لباس کی پرواہ بالکل نہیں کرتے تھے میں نے مسجد میں ان کو پھٹے ہوئے
فوجی موزے پہنے ہوئے دیکھا ہے۔
وہاں جو صاحب امامت کرتے تھے ان کا نام حاجی امانت تھا۔ وہ ایک سیکشن آفیسر

تھے۔ اچھے نیک آدمی سمجھے جاتے تھے اس لئے وہ اس مسجد میں نماز پڑھانے لگے تھے۔ جب جنرل ضیاء اقتدار میں آئے تو وہ بھی ان کے پیچھے وہیں نماز پڑھنے لگے۔ کینٹ ڈویژن سے ریٹائر ہونے کے بعد حاجی امانت کو افضل سعید نے پرائم منسٹر سیکرٹریٹ میں دو سال کے لئے رکھ لیا تھا۔ ان کو بجٹ وغیرہ کا کافی تجربہ تھا۔

دو سال بعد حاجی امانت کی مدت ملازمت ختم ہونے والی تھی۔ جب اس میں ایک ہفتہ رہ گیا تو انھوں نے وہیں مسجد میں جنرل صاحب سے کہا بس اب میں ایک ہفتہ بعد چلا جاؤں گا۔ جنرل صاحب نے وجہ پوچھی جب انھیں معلوم ہوا کہ وہ ریٹائر ہو رہے ہیں۔ تو انہوں نے وہیں اپنے سیکرٹری سے ان کی ملازمت میں توسیع کرنے کے احکامات جاری کر دیئے پھر تو یہ سلسلہ قائم ہو گیا اور ہر سال دو سال بعد اسی طرح وہ مسجد میں اپنی ملازمت میں توسیع کے احکامات حاصل کرتے رہے اور اس طرح انہوں نے کل تیرہ سال کی توسیع کرائی اور ۱۹۸۸ء میں ریٹائر ہوئے۔

میرے خیال میں پاکستان میں ملازمت میں توسیع کا یہ یکہ ریکارڈ ہے جو سوائے حاجی امانت کے اور کسی کو نصیب نہیں ہوا۔ اور اس کی وجہ صرف جنرل ضیاء الحق تھے ایک مرتبہ ایک ریٹائرڈ فوجی افسر سے میری بات چیت ہو رہی تھی۔ ہمارا موضوع گفتگو جنرل صاحب ہی تھی۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ جنرل صاحب کو دو چیزوں کا بہت شوق ہے۔ ایک کھانے کا دوسرے بولنے کا۔ اس کے علاوہ ٹی وی کے ڈرامے بھی ٹی وی اسٹیشن سے منگوا کر دیکھتے تھے اور اپنی تقریروں کے کیسٹ بھی منگوا کر دیکھا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں ناہید اختر کے گانے بہت پسند تھے۔ شاید ناہید اختر کے گانے پسند کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ کچھ عرصے ملتان میں کور کمانڈر رہے تھے اور شاید اسی وقت سے ناہید اختر کو سنتے رہے ہونگے یہ میرا ذاتی خیال ہے۔ اس کی وجہ ذاتی پسند بھی ہو سکتی ہے۔

جنرل صاحب اقتدار سنبھالنے سے قبل جس کوٹھی میں چیف آف آرمی اسٹاف کی حیثیت

رہتے تھے۔ مارشل لاء لگ جانے کے بعد بھی وہ یہیں رہے، اور اسی کا نام آرمی ہاؤس رکھ دیا گیا اور میں نے سنا ہے کہ وہ کہا کرتے تھے کہ وہ کوٹھی انھیں بہت راس تھی اس لئے وہ وہاں سے ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔

جس کمرے میں مسٹر بھٹو بیٹھا کرتے تھے، وہ وہاں کبھی نہیں بیٹھے اس کو انہوں نے Reception Room بنا دیا تھا۔

شرافت حسین شفقت نے اپنی کتاب میں لکھا ہے۔

”جنرل ضیاء الحق توہم پرست بہت تھے۔ کلکتہ کے گپتا پریس میں شائع شدہ جنتری ۱۹۸۸ء میں یہ پیشگوئی شائع ہوئی کہ جنرل ضیاء الحق خطرے میں ہیں اور فضائی حادثے میں ان کی زندگی ختم ہو سکتی ہے۔“

ادھر ۱۳ جولائی کو بارہ جماعتوں کے اتحاد نے بھی انھیں پریشان کیا، کیونکہ ان کا اپنا مدد وہ تھا جسے ہم سے خطرہ لاحق ہو سکتا ہے۔۔۔۔ انہی دنوں مشہور منجم ایم اے ملک نے یہ پیشگوئی کردی کہ ضیاء الحق کے عہد میں ڈرامائی تبدیلی ہو سکتی ہے۔ ان سب باتوں نے انہیں بے حد خوفزدہ اور چڑچڑا بنا کے رکھ دیا تھا۔ وہ اتنے سراسیمہ تھے کہ قومی اسمبلی توڑنے کے بعد ایک رات بھی آرمی ہاؤس راولپنڈی سے باہر نہیں گزاری۔“

وہ نفاذ اسلام کے لئے ایک ریفرنڈم کرانا چاہتے تھے۔ مگر ۱۷ اگست کے حادثے میں وہ جاں بحق ہو گئے اور ان کا یہ خواب پورا نہ ہو سکا۔

ان کی معذور بیٹی زین ان کی بہت بڑی کمزوری تھی۔ وہ اکثر ملازم کے ساتھ مسجد میں آکر ظہر کی نماز میں پیچھے بیٹھ جایا کرتی تھی۔ اور ہمیشہ فوجی یونیفارم پہنتی تھی۔ پیچھے سے اللہ اللہ کی آوازیں آتی رہتی تھیں۔ میں نے سب سے پہلے اسے وہیں دیکھا اور پتہ چلا کہ وہ جنرل صاحب کی بیٹی ہے وہ ذہنی طور پر معذور ہے۔ جنرل صاحب اس سے بے پناہ محبت کرتے تھے اور اسکی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے جو بھی اس کے منہ سے نکلتا تھا، پورا کرتے تھے۔

ایک مرتبہ لاہور میں ایک خاتون بیگم ر کا قتل ہوگیا تھا اور وہ اس طرح کہ چور ان کے گھر میں گھسے۔ اس کے بھائی نے دیکھ لیا اور اس نے مزاحمت کی ایک چور نے اسے پکڑ لیا۔ بہن بھائی کو بچانے کے لئے بڑھی تو دوسرے چور نے اس کے پیٹ میں چاقو بھونک دیا اور وہ وہیں ختم ہوگئی۔ بعد میں وہ چور پکڑا گیا۔ مقدمے میں نیچے کے ہر کورٹ نے اسے پھانسی کی سزا تجویز کی تھی۔ اس زمانے میں اس کا ایک رشتہ دار جنرل صاحب کی معذور بیٹی زین کی دیکھ بھال پر مامور تھا اس شخص نے زین سے اس چور کی سفارش جنرل صاحب تک پہنچوائی اور چونکہ ضیاء صاحب اس کی کوئی بات نہیں ٹالتے تھے۔ اس لئے انہوں نے اسے رہا تو نہیں کیا البتہ اس کی پھانسی کی سزا عمر قید میں تبدیل کر دی۔

جنرل ضیاء الحق نے اپنے زمانے میں جو کام معذور افراد ان کی دیکھ بھال اور ان کے اداروں کی مالی امداد کے سلسلے میں کیا ہے وہ واقعی قابل تعریف ہے۔ ہوسکتا ہے۔ اس کی وجہ نفسیاتی ہو کیونکہ ان کی بیٹی زین خود ایک معذور لڑکی ہے اس لئے ان کے دل میں معذور افراد کے لیے ہمدردانہ جذبات کا ہونا ایک فطری عمل ہے۔ بہر حال جنرل ضیاء الحق کا یہ کام ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

خدا کا شکر ہے کہ میں جنرل ضیاء الحق کے اقتدار میں آنے کے صرف دو سال بعد یعنی ۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو باعزت طریقے پر اپنی ملازمت کی مدت پوری کر کے ریٹائر ہوگیا۔

انہوں نے اپنے دور حکومت میں بہت سے اسٹاف ممبران اور دیگر لوگوں کو سرکاری خرچ پر فریضۂ حج کی ادائیگی کے لئے بھیجا۔ مگر خدا کا شکر ہے میں نے معہ اپنی بیگم کے اپنے ریٹائر کے بعد ۱۹۸۲ء میں عمرہ اور پھر ۱۹۸۵ء میں حج کی سعادت اپنے خرچ پر حاصل کی۔ علاوہ از ہم نے اپنی مرحومہ بیٹی دردانہ کی طرف سے بھی عمرہ ادا کیا۔ خدا قبول فرمائے (آمین)

۱۷ اگست ۱۹۸۸ء کو جب جنرل ضیاء الحق کئی بڑے بڑے جنرلیوں اور امریکی سفیر کے ہمراہ بہاولپور سے اسلام آباد واپس جانے کے لئے C-130 جہاز میں سوار ہوئے تو وہ

اڑنے کے ذرا ہی دیر بعد حادثے کا شکار ہو گیا۔ ہوائی جہاز اور تمام مسافروں کے پرخچے اڑ گئے بہر حال کچھ افسران کی شناخت کر کے ان کے جنازے تیار کر دیئے گئے اور جنرل ضیاء الحق کے جنازے کو بہت بڑے اجتماع کی موجودگی میں اسلام آباد کی فیصل مسجد کے احاطے میں دفن کر دیا گیا۔

اس کے بعد اس حادثے کی تحقیقات مختلف ذرائع سے کی گئی مگر آج تک کوئی حتمی بات معلوم نہ ہو سکی۔ بہر حال اس تمام گفتگو کے اختتام پر مجھے افلاطون کا قول یاد آتا ہے کہ کسی انسان کی افتادہ طبع کا سراغ آدمی کے معمولی معمولی کاموں سے ملتا ہے بڑے بڑے کاموں سے نہیں۔
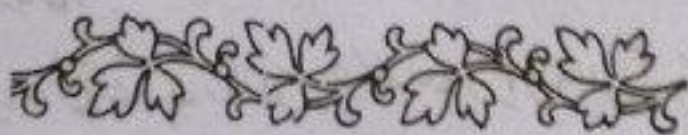
۱۹۹۲-۹۳ء کے لئے
زبیری پبلشرز کا اشاعتی پروگرام

۱- سیرت سیدنا حضرت زبیرؓ- (مولف- حسین احمد زبیری صاحب)
۲- مجلّہ الزبیرؓ- (حضرت زبیرؓ کے اہل خاندان کی علمی کاوشوں کا ایک جائزہ)
۳- ضیائے حیات (سوانح عمری ڈاکٹر سر ضیاء الدین احمد)
مولف محمد امین زبیری صاحب- صفحات ۴۰۰
۴- جذبات اشک (مجموعہ کلام منیر الدین حسین اشک مارہروی)
۵- "کتاب نعت" (نعتیہ کلام- ظفر عمر زبیری)
۶- گورنر جنرل ہاوس سے آرمی ہاوس تک
۷- "بصیرت" بصیرت افروز نظم- (شاعر ڈاکٹر قیوم پاشا زبیری)
شائع ہوگئی ہے قیمت: ۵۰ روپے
۸- "کلام صدیق" مجموعہ کلام- صدیق حسن صدیق مارہروی)
شائع ہوگیا ہے- قیمت ۴۰ روپے